نیل کنٹھ اور نیم کے پتے

نظمیں دوھڑے اور گیت

ایاز

دانیال

نیل کنٹھ اور نیم کے پتّے

نیل کنٹھ اور نیم کے پتّے

شیخ ایاز

دانیال

پہلی بار : ۱۹۸۸ء
ناشر : جوری نورانی
مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر،
عبداللہ ہارون روڈ کراچی
طابع : احمد برادرس۔ ناظم آباد۔ کراچی
قیمت : Rs. 65-00

سرورق کی پینٹنگ کے لئے ہم مشہور مصور جناب اے آر ناگوری کے مشکور ہیں۔

مسرّت مرزا اور مرحب قاسمی کے نام

ترتیب

پیش لفظ

سندھی زبان میں شیخ ایاز کی شاعری تیزی سے بہتے ہوئے طوفانی دریا کی طرح ہے۔ ان کی نظموں اور غزلوں کا یہ اردو انتخاب ایسا ہے جیسے اسی دریا سے ایک نہر نکالی گئی ہے۔ اس نہر کے پانی میں ایاز کی شاعری کے خدوخال کی جھلکیاں نظر آسکتی ہیں گو اس شاعری کے پورے چہرے کا دیدار نہیں ہو سکتا۔ لیکن ایک نمونہ "مشتِ از خروارے" کے طور پر غیر سندھیوں کے لئے ایاز کی شاعری ہلکا سا تعارف ضرور ہے۔

ایاز کی شاعری کی اہم خصوصیات کیا ہیں؟ اپنے خطۂ زمین سے پیار، اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف ایک تیز و تند احتجاج ان کی شاعری کے ایک بڑے حصّے کا سرچشمہ رہا ہے اور اس احتجاج نے بھی سو رنگ اختیار کئے ہیں، کہیں گہرا دُکھ، کہیں بھڑکتا ہوا غصہ، کہیں کٹیلا طنز، زہرخند، تو کہیں تسلّی بھری شفقت کے بول، غرض ایاز کی سندھ کے لئے شاعری بذاتِ خود اپنے اندر ایک عالم رکھتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ کسی غیر سندھی کو بھی متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی یہی اس خاص نوعیت کی شاعری کی عظمت کی پہچان ہے۔ اسے پڑھنا ایک غیر سندھی کو بھی سندھی بنا دیتا ہے۔ کیونکہ ایاز کی شاعری نسلی نفرت یا تعصب سے بالکل پاک ہے۔ پھر بھی سندھ کے لئے ایک گونجتا لہراتا نعرہ ہے۔ سندھ کے مخصوص حالات ایسے رہے ہیں کہ سندھ ان کی شاعری کا نیم کا پیڑ ہے۔ گھنی چھاؤں دینے کے باوجود اس کے پتّوں میں کرواہٹ ہے۔ (مگر اس کا پکا پھل پھر بھی میٹھا ہے اور خون صاف کر سکتا ہے) اور اس نیم پر نیل کنٹھ خود شیخ ایاز ہیں۔ ایک رنگ برنگا پرندہ جس نے زہر کا گھونٹ بھرا ہے۔ جو اس کے گلے پر نیلی دھاری بن گیا ہے وہ ایک شاعرِ تلخ نوا بن سکتا ہے اور کبھی کبھی ہنستا ہے۔ ان کے نئے مجموعہ کلام کی ایک نظم پڑھ کر میں سارا دن ہنستی رہی۔ آپ کے لئے ترجمہ کرتی ہوں۔

فاشی فوج کی شکست

. . . .

. . . .

دیکھیے کتنے رسالے آرہے ہیں
کس قدر کرتے تھے بڑ بڑ
کس قدر کرتے تھے "اکڑ"
مورکھائی کے توالے آرہے ہیں
یہ یہ کل تک ہار اپنی
یاد رکھ پائیں گے یہ کیا مار اپنی
کس قدر مایوس رسالے آرہے ہیں

تو اس طرح ایاز کا ایک بانکپن ہے۔ وہ روایتی شاعر نہیں ہیں جس طرح یگانہ روایتی شاعر نہ تھے لیکن یگانہ صرف بانکے تھے۔ ایاز کی شاعری کے پہلو متعدد ہیں ایاز کی حسّیت پسندی اور ان کے ساتھ روحانیت کی طرف ان کا رجحان۔ یہ بھی شاعر کی زندگی بھر کی کشمکش کا غاز ہے۔ یہ گویا اس بافتہ کا تانا بانا ہے جس نے بڑے خوبصورت، دلآویز نقش و نگار بنائے ہیں۔

ایاز کا تخیّل کتنا خوبصورت ہے اور وہ کتنی سادگی اور پرکاری سے اپنی بات کہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کی ہمیشہ یاد رہ جانے والی نظم "دور کیلاش سے" میں ملتی ہے۔

دور کیلاش سے، چاند ہیمنت کا
میرے من کو ہمیشہ بلاتا رہا
میں کہ رن بیر تھا

برچھ کی چھاؤں میں، میں نہ بیٹھا کبھی
بیریوں نے کبھی یہ شکایت نہ کی
میں نے لڑتے ہوئے وار اوچھے کیے

مارنے سے کبھی ہچکچاہٹ نہ تھی
اور نہ مرنے کا ڈر
رن کی جلتی ہوئی ریت پر، ہاں مگر
دور کیلاش سے
چاند ہیمنت کا
میرے من کو ہمیشہ بلاتا رہا

اس نظم میں ایاز نے خود اپنی شاعری پر جیسے ایک حسین اور بھرپور تبصرہ کر دیا ہے۔ ایاز کی اس نظم کا میں نے بھی ترجمہ کیا تھا اور سارے وقت گنگناتی رہی تھی۔ شیخ ایاز کو شاعری کے پُراسرار فن کا کوئی ناقابلِ بیان راز معلوم ہے۔ یہ تو سراسر دین ہے۔ ان کی شاعری کے ساگر میں کئی دھارے آکر گرتے ہیں۔ ہندوستانی قدیم دیومالائی تصورات کی دھرتی سگندھ سے بوجھل بوجھل سی نمی، سندھ دھرتی کے اپنی مخصوص شعری ورثہ کا سُرتال اور آہنگ، ہند ایرانی تصوف کی سرمستی، جدید انسان کا سیاسی اور سماجی شعور، اور پھر ان سب پر مستزاد شیخ ایاز کے خالص اپنے، ذاتی، تیکھے تیور۔۔۔ ان سب سے مل کر ان کی شاعری عبارت ہے۔ ایاز کا کلام پڑھ کر میں نے اکثر تعجب کیا ہے کہ آیا یہ فکر و فلسفہ کا ترنم ہے یا خود نغمگی اور ترنم گہرے غور و فکر میں غرق ہیں۔ ایسا سنگم کسی کسی ہی شاعر کے کلام میں نظر آتا ہے۔ خود ایاز نے اپنی ایک نظم میں لکھا تھا۔

آج کوبیتا کی پنگھٹ پر
سرس وتی اور کالی نے،
ساتھ ساتھ، رس کا گھونٹ بھرا ہے
یہ سنگم برسوں کے بعد ہوا ہے
کوئی مہا کوی جنما ہے

شیخ ایاز۔ بلاشبہ ایک مہاکوی ہیں۔ ان کے اصل مقام کو آج جو پاک و ہند برِصغیر میں بہت کم لوگ جانتے ہیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ان کا تعلق اس برِصغیر کے انتہائی کنارے کے ایک چھوٹے سے خطے سے ہے جس کی زبان اپنے علاقے تک محدود ہے ورنہ حقیقت تو

یہ ہے کہ آزادی کے بعد، ایاز کے لوہے کا کوئی دوسرا شاعر ہندوستان یا پاکستان میں ادب
کے اُفق پر ابھی تک نمودار نہیں ہوا ہے۔

"نیل کنٹھ اور نیم کے پتے" کی اشاعت غیر سندھیوں کے لئے اس وسیع اور
ہمہ گیر کلام کا تعارف ہے۔ ایاز کے کلام کے ایک حصّے کا ترجمہ میں نے بھی کیا ہے۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ اب کوئی دوسرا دل والا اُٹھے اور اس ستارے پر کمند اُچھالے اور
ایاز کے تمام کلام کو اُردو میں منتقل کر دے۔

فہمیدہ ریاض
کراچی سنہ ۸۸ء

(۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۱ء تک)

○

دلِ یزداں نے کہا، ایک خزانہ ہوں میں
کیوں نہ عالم پہ گہر پاش بنوں !
پھر گُل و لالہ و شبنم کو بکھیرا اُس نے
سُرمئی چادرِ شب کو، مہ و انجم سے بنایا زرکار
اور حسینانِ جہاں کو، دُرِ دنداں بخشے۔
اُسے معلوم نہ تھا
کہ گُل و لالہ، جگر چاک بنیں گے اک دن
اور یہ شبنم بسر اوقات کرے گی رو کر
سرِ افلاک بھٹکتا ہی پھرے گا یہ چاند
اور انجم کی جھپکتی ہوئی آنکھوں میں کبھی
نیند ہوگی کہ نہیں
اُسے معلوم نہ تھا، ہائے کہ ہنستے ہوئے لب

کبھی بیچارگی و غم کو دَبا رکھیں گے
دامنِ دل میں کئی اَشک چھُپا رکھیں گے

○

سرابوں میں کھوئے ہوئے آہوانِ رمیدہ
کھڑے سوچتے ہیں
حیاتِ گریزاں تلاشِ مسلسل
سہم تشنگی، حاصلِ زندگانی
یہ کیسا ستم ہے
کٹی عمر اک جرعۂ آب کی جستجو میں -
کبھی ڈھلتا سورج
مثالِ نگیں، خاتمِ ریگ میں جگمگا کر
بلاتا ہے سوئے اُفق اُن کے قلب و نظر کو
دیارِ فلک سے کبھی ماہ و انجم
انھیں بھیجتے ہیں سلامِ تبسم
بہ وقتِ طلوعِ سحر، بادِ صحرا

اُڑا دیتی ہے رُوح کا ہر تذبذب
مگر پھر وہی آفتابوں کے تیر و سناں
اور سینہ فگاروں کی جلتی ہوئی داستاں
تشنگی، جستجو، تیز لُو، دشتِ ویراں
سرابِ مسلسل، حیاتِ گریزاں
یہ کیسا ستم ہے
کٹی عمر اک جرعۂ آب کی جستجو میں

○

پھول جھڑتے ہیں
چاند ڈھلتا ہے
یہ بدن ، یہ حرم ، یہ کعبۂ پاک
کیوں بنایا گیا ہے قصرِ خاک
آرزوئیں برات کی مانند
زندگی کی حسین دُلہن کو
موت کی سیج پر سُلاتی ہیں
زندگی کی حسین شہ راہیں
وادیٔ تیرگی میں ملتی ہیں

○

مری رُوح کی راگنی سُن رہے ہو
پُرانی سی لَے ہے پُرانے سے نغمے
پُرانی سی مَے ہے، پُرانے سے شیشے
جنھیں میں چُرا لایا ہوں ساقیانِ ازل سے
بصد زعمِ زاہد، بصد رنجِ ناصح
پلاتا رہا ہوں نئے میکشوں کو
کوئی کہہ دے یہ ساکنانِ چمن سے
مَیں وہ پھُول لایا ہوں چُن چُن کے بن سے
جو صدیوں سے خوشبو دیئے جا رہے ہیں
پرستش کے قابل وہ اصنام لایا ہوں میں
جو کہ روحِ اَبد میں تراشے گئے تھے
مگر وہ جبینیں کہاں، اِمتیازِ پرستش کہاں ہے؟

○

مَیں ہرن اور تُو مری ہرنی
آرزوؤں کی تشنگی لے کر
زندگی کے سراب میں ہر روز
میں تری جستجو میں پھرتا ہوں
تیرے ہونٹوں کو چُوس کر ہی میں
تشنگی سے نجات پاتا ہوں
رُوحِ آبِ حیات پاتا ہوں

○

آرزوئیں پجاریوں کی طرح
رُوحِ شاعر کے سُونے مندر میں
آج ناقوس سا بجاتی ہیں
میری دیوی کا مَرمَریں سا جسم
میری یادوں میں رقص کرتا ہے

O

میں نے انساں کے دل میں جھانکا
ایک چھوٹا سا کنواں
جس میں عکسِ مہ و انجم کے سوا کچھ بھی نہ تھا
مَیں نے چُلّو میں لیا کچھ پانی
اور بَلائیں دو جَہاں کی نظر آئیں مجھ کو

○

یہ انساں
یہ مُرغابیاں
بہتے پانی پہ سایہ کناں
پر فشاں
جا رہی ہے کہاں
یہ فرازِ زمیں، وسعتِ آسماں
یہ سُہانا سماں
کتنا پُر کیف ہے یہ سفر
کاش ہوتا نہ ان کے دلوں میں
کمیں گاہ کے اک شکاری کا ڈر

○

تڑپتی ہوئی بجلیوں کی طرح
معنیٔ حسن کا شانۂ قلب پر آ گرے
اور میں ایک سہما سا پنچھی
اسے دیکھتا رہ گیا
تب سے میرے لئے
یہ بہار و خزاں کچھ نہیں
رنگ و بُو کچھ نہیں، دانہ و آشیاں کچھ نہیں
جورِ صیّاد یا شفقتِ باغباں کچھ نہیں
بادلوں کی تہوں میں بھٹکتا ہوا
ایک حیرت زدہ شوقِ وارفتہ ہوں میں

○

تیرے ہونٹوں سے میں نے پی تھی مے
عمر بھر مستی و خمار رہا
تیرے عارض سے چن لئے تھے پھول
موت تک موسم بہار رہا

پریشان خیالو!
مرے حشر ساماں سوالو!
مجھے چھوڑ جاؤ کہ مجھ کو ذرا نیند آنے لگی ہے
کہ میرے پپوٹوں پہ انبار بے خوابیوں کے لُڑھکنے لگے ہیں
مری کُلبُلاتی ہوئی رُوح اس زندگی کے قفس سے
گھڑی دو گھڑی کے لئے بھاگنا چاہتی ہے
پریشان خیالو!
مرے حشر ساماں سوالو!
کہاں جا رہے ہیں ستاروں کے یہ اَن گِنَت کارواں
یہ کسی نے نہ جانا
یہ مسحُور راہی کہاں جا رہے ہیں؟
کسی منزلِ نُور کی جستجو میں!

مگر یہ تو میرا فریبِ نظر ہے
طلسمِ خیالِ بشر ہے
یہاں منزلِ نور کوئی نہیں ہے
ازل سے ابد تک کوئی جاوداں تیرگی پیچ و خم کھا رہی ہے
یہ دُنیا، یہ آماجگاہِ تمنّا
کہاں جا رہی ہے؟
یہ رقّاصۂ روز و شب نوکِ خنجر پہ یوں ناچتی جا رہی ہے
کہ جیسے اُسے یہ یقین ہو گیا ہو
کہ اب پاؤں چھلنی نہ ہوں گے
یہ انساں کہ صیّادِ روزِ ازل ہے
کہ پھینکیں ہیں کرنوں پہ جس نے کمندیں
یہ تیّار کرتا ہے ہر روز ایسے انوکھے قفس کو
جسے توڑ دیتا ہے پَر پھڑپھڑا کر کوئی طائرِ نیم بسمل
نہ جانے مجھے کیوں یقیں ہو گیا ہے

کہ انسان خود ایک صیدِ زبوں ہے

پریشاں خیالو!

مِرے حشر ساماں سوالو

نہ جانے مجھے کیوں یقیں ہو گیا ہے

کہ یہ پیکرِ خاک لاکھوں نقابِ زرفشاں بدلتا رہے گا

مگر رو سیاہی چھپے گی، نہ اس کی

بُجھا دو یہ تاروں کے قندیل

فانوسِ ماہِ درخشاں

تصوّر کی اس جھلملاتی ہوئی جھیل کو تیرگی میں چھپا دو

کہ یہ رَوشنی میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر دے

مجھے نیند سی آ رہی ہے

○

زندگی ایک تصوّر کی فسوں سازی ہے
جھلملاتی ہوئی جھیلوں میں تری غوطہ زنی
تیرتے تیرتے افسوس تری دل شکنی
تُو نے اے دوست جسے دُور سے ساحل سمجھا
وہ تو اک موجۂ بے رَو کی سکوں بیزی ہے
کہ تجھے غرق تہہِ آب کرے گی اک دن
تُو نے چاہا ہے چراغِ سرِ منزل بننا
تجھے معلوم نہیں ہے، سرِ منزل کیا ہے
تیری نظریں تو ہیں سوئے شفق لالہ فشاں
اور پاؤں ہیں کہ تیزی سے بڑھے جاتے ہیں
سرِ منزل تو ہے اے دوست فقط ایک نشیب
کہ گرائے گا تجھے موت کے انگاروں پر

میں نے سیکھا، لبِ ساحل سے نظارا کرنا
اور ہر منزلِ انساں سے کنارا کرنا

○

میں ہوں اک تنہا راہی
نگر نگر میں ڈگر ڈگر پہ بھٹک بھٹک کر آیا ہوں
دھرتی یا آکاش پہ مجھ کو کہیں نہ آیا چین
گزر گئے دن رین۔
دھوپ بھی دیکھی چھاؤں بھی دیکھی
میرے من کا اڑتا پنچھی
ڈال ڈال پہ کسی بسنت کی آس کا مارا پھرتا رہا
میں ایک ہرن تھا وحشی سا
اس جیون کے بن میں برسوں پیاس کا مارا پھرتا رہا
کبھی کبھی میں نے پھولوں سے اپنی سیج سجائی تھی
کبھی کبھی اک جوئے شیریں میری راہ میں آئی تھی

میں ہوں اک تنہا راہی
نگر نگر میں ڈگر ڈگر پہ بھٹک بھٹک کر آیا ہوں
دَھرتی یا آکاش پہ مجھ کو کہیں نہ آیا چین
گزُر گئے دن رَین ۔

○

کِسی پھُول سے پریت نہ کرنا
کِسی پھُول کو میت نہ کہنا
پھُول سَدا مُرجھا جاتے ہیں
کانٹوں میں اُلجھا جاتے ہیں
کسی چاند سے پیار نہ کرنا
کسی چاند کو یار نہ کہنا
پنچھی ان کو کب پاتے ہیں
اُڑتے اُڑتے تھک جاتے ہیں

○

اگر تو قریں تھی
تو خوشبو سے لپٹے اندھیرے
مہکتے سویرے
تری زُلفِ برہم ترا روئے روشن
مری رُوحِ آوارہ فطرت کو اپنی محبّت میں بھینچے ہوئے تھا
وہ دن تھے کہ تیری کمر، میری قوسِ قزح تھی۔
مرا دل ترا اَبر پارہ
مگر مجھ کو اُس سے شکایات سی تھیں
حیا و ریا کی حکایات سی تھیں
یہ قوسِ قزح کیوں دلآویز رنگینیوں کو لٹاتی رہی ہے
کہ ہر اَبر پارے پر اُس کی محبّت کی اک داستاں سی رقم ہے
ابھی دُور ہو تم

مہکتی فضائیں ، چہکتی تمنّا وہی ہے
یہ رنگینیوں کا جہاں ہے
یہاں ایک قوسِ قزح تو نہیں ہے !
مجھے اب کسی سے شکایات کیسی
حیا و ریا کی حکایات کیسی
مگر گاہے گاہے
مرے دل میں اک تیر تا سا خیالِ گریزاں
خیالاتِ موّاج کو چیر کر بھاگتا ہے
کہ یہ ابر پارہ یہ قوسِ قزح کاش چاند اور ہالا بنے
اور دونوں دوبارہ گلے مل کے آوارگی بھول جائیں

میں نے جب محفلِ انجم کو بکھرتے دیکھا
شورشِ ہستیٔ عالم کو نکھرتے دیکھا
جب دمِ صبح ستارے ڈوبے
اور اک نور کا سیلاب اُمڈ کر آیا
تو مرے دل پہ ترا خواب اُمڈ کر آیا
خواب جو رات مری رُوح کو اُکساتا تھا
خواب وہ جس نے مٹائی تھی مری قیدِ حدود
میں تری لذّتِ آغوش کو چھو سکتا تھا
اور اس ہستیٔ دلدوز کی لاکھوں چیخیں
میں تری موجِ تبسم میں ڈبو سکتا تھا
کھُل گئی آنکھ مری

جب کہ اک نور کا سیلاب اُمڈ کر آیا
اور اس ہستیِ دلدوز کی لاکھوں چیخیں
چونک اُٹھی مری مانوس سماعت جن سے
ہم زباں ہو کے یکایک گونجیں
زندگی ایک تبسّم کی گراں یابی ہے

(

میکدے کو جگمگاؤ
میکشانِ پیر کی ہے یہ مئے کہنہ پلاؤ
کیف و مستی کے خداؤ
لڑکھڑاؤ
خوب گاؤ
آج میں نے روحِ بادہ دیکھ لی ہے
اِک نگاہِ حسنِ سادہ دیکھ لی ہے

میں نے دیکھا ہے اسے

کون کہتا ہے کہ وہ جلوۂ مستور مرا واہمہ ہے
چاندنی راتوں کے احساسِ جمیل
تم بتاؤ کہ وہ محبوبِ حسیں
میری آغوش میں کس طرح مچل جاتا ہے
موسمِ گُل کی سلگتی شامو
تم بتاؤ کہ مرا کاشانہ
آتشِ گُل سے دہکتا ہے جب
بارشِ حسنِ دو عالم کی طرح
حلقۂ بوئے چمن سے وہ مِرا پیکرِ ناز
ہائے کس طرح مہکتے لب و رخسار لئے
خلوتِ دل میں چلا آتا ہے

ہائے یہ دَولت و ثروت کا پُجاری یہ ہجوم
خونِ انسان کو چراغوں میں جلانے والا
تیرگی اور بڑھانے والا
کون سمجھائے اُسے جلوۂ مہتاب بھی ہے
کون سمجھائے اُسے
تیری آنکھوں سے ترا نُور تری بیداری
چھین ہی لے گی کبھی
جو کہ ہو حاصل بینائیِ دل
ایسا ایک خواب بھی ہے

○

کنجِ ویراں میں اکیلا بیٹھ کر
مے کہاں کی چاندنی پیتا ہوں میں
یہ طلسمِ ہست و بود
آسمانِ نیلگوں
چاند تاروں کا فسوں
اِک ازل کی کیف و مستی بخش دیتا ہے مجھے
اور مَیں
جھومتا گاتا ہوا
کیف برساتا ہوا
سَاغرِ مہتاب کو تھامے ہوئے
آسمانوں میں چلا جاتا ہوں دُور
اور بہ ہنگامِ سرور
کچھ خُدا کو بھی پلا دیتا ہوں میں

○

کِھلتا پھول کنول کا
ننّھا بچّہ
ماں کی چھاتی سے چمٹا ہے
پھول پہ پھول کھِلا ہے
لیکن دونوں پھول ہیں جس کے
وہ بھونرا ہرجائی بھونرا
کیا جانیں
کِس دیس گیا ہے

○

شفق میں کبھی سایۂ پرفشاں قاز کا
تُو نے جوئے خراماں پہ دیکھا تو ہو گا
کبھی تُو نے سوچا تو ہو گا

نہ سایہ حقیقت نہ جوئے خراماں حقیقت
نہ سیلِ زمانہ حقیقت نہ اِنساں حقیقت
فقط ایک رَو ہے فقط ایک پرواز سی ہے
چمکتا ہوا خمُ بہ خمُ ابرِ نیساں
یہ بارش میں بھیگی ہوئی روحِ انساں
سراسیمہ، حیراں
صدف در صدف خوابِ ہستی دُرافشاں
یہ ڈھلتا ہوا دن یہ سُورج یہ پیالے

یہ شب خیز مے یہ طرب ریز باتیں
یہ مدہوش آنکھیں یہ تیرے شوالے
جہاں دیپ بن کر جلی ہیں
تری آرزوئیں
جہاں کھو گئی ہیں تری جستجوئیں
یہ سرگوشیاں، خیمۂ آرزو کی قناتیں
یہ قُلقُل، یہ گُلبانگِ مینا، یہ راتیں
یہ جشنِ چراغاں، تری زندگی کا
مہکتا ہوا پھول تیری خوشی کا
چہکتا ہوا گیت، زندہ دلی کا!
دمکتا ہوا رنگ تیرے لبوں کا

گُلِ شبنم آلود سا ہے
یہ چہرہ ترا چیت کی چاندنی میں دُھلا ہے
مگر غور سے دیکھ پیارے
کہ ہر شے کفِ موج میں بُلبُلا ہے

(ہائکو)

راتبھر موجِ رَواں پر ڈولتا
ایک چھوٹا سا دیا

○

سایۂ مہتاب، چرخِ نیلگوں
اور فضا میں پرَفشاں و پُرفسوں
اِک پرَندے کا جنُوں

○

تیرگیٔ نیم شب، مثلِ عیار
جس پہ سونے کی لکیر
ہے یہ کویل کی پُکار

یہ شبِ خاموش و ویراں، یہ ہوا
اور رِدائے تیرگی اوڑھے ہوئے
ایک جھینگر کی صدا

○

آج بادل چھٹ گئے
اور کوئیں کی گہری تہہ میں چاند کا
عکس لہراتا رہا

○

صبح دم گہوارۂ موجِ صبا
جب رُک گیا
خوشۂ گندم کی آنکھیں کھل گئیں

○

یہ ہوا، یہ آسماں
یہ لبِ ساحل یہ ساون کا سماں
جل رہے ہیں کشتیوں میں کچھ دیے
اُڑ رہی ہیں روشنی کی تتلیاں

○

پھر گزشتہ رات خستہ تن خدا
میرے دروازے پہ آ کر رُک گیا
اور میں سوتا رہا

○

گرچہ چمپا کی کلی
رات بھر سوتی رہی
شورِ حشر انگیز تھا
صبح تک طوفانِ ہیبت خیز تھا

○

بحرِ ناپیدا کنار
ریگِ ساحل پر کئی نقشِ قدم
ہے جنھیں موجِ بلا کا انتظار

قطعات

دشنۂ ساز سینۂ شب میں
نالۂ نے مثالِ سیلِ خوں
آج پھر کوئی راہِ مشرب میں
لوٹتا ہے متاعِ اہلِ جنوں

(۴)

نشۂ زیست ماہتاب بہ کف
لغزشِ عشق کہکشاں بہ قدم
تو ہی کہہ دے کہ خاکِ پاکِ وجود
کس طرح خوابِ خلد سے ہے کم

(۵)

پھر کوئی بادۂ ازل لے کر
کوزہ گر کی دکاں پہ آتا ہے
اور بڑی احتیاط سے چُن کر
اپنے جام و سبو اٹھاتا ہے

نین کنول مُرجھائے
سَاجن لَوٹ نہ آئے

آشا کی اگنی تو من میں دیپ پہ دیپ جلائے
سمئے پُرانا پاپی جگ میں لاکھوں چاند بجھائے
ڈگر ڈگر بھٹکائے
ساجن لوٹ نہ آئے

کیا جانے میرے نینوں سے نندیا کون چُرائے
کاش مجھے آکاش پہ ایسا اک تارا مل جائے
جو چاند کا دیس دکھائے
ساجن لوٹ نہ آئے

بیتی رتیاں آج جو مجھ کو میرا کل مل جائے
میں جیون کی ناؤ ڈبو دوں جو وہ مانجھی آئے
کون اُسے سمجھائے
سَاجن لوٹ نہ آئے

کہاں سے اُڑ کے آیا پنچھی
کہاں ہے اُس کا دیس ؟
نیل گگن میں اُڑنے والا دُور دور سے آیا
کس نے اس پاپی نگری میں پنجرے میں بٹھلایا
اک سندر سپنے میں دیکھی اُس نے جگ کی مایا
سارا جیون بہتے پانی پر چندا کی چھایا
ایسے سمے میں کھو کر مورکھ بھولا اپنا پرایا
کبھی کبھی چندا سے اس نے دور سے نیہہ لگایا
لیکن چاروں اور سلاخیں جب اُڑنے پر آیا
کس نے اُس کی بپتا دیکھی اور پنجرے کو ڈھایا
بن پنکھ لگا اُڑنے پھر پنچھی
گیا بدل کر بھیس —

○

من میں میگھ ملار کوئی کی آنکھوں میں برسات
سارے جیون پر پھیلا نا
اک سپنے کا تا نا با نا
اسی لگن میں مگن مگن سا رہتا ہے دن رات
ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنا
اور تاروں سے باتیں کرنا
جانے کب تک جگ پہ رہے گی کالی کالی رات
بیٹھا ہے یہ آس لگائے
کب پھولوں کی دُلہن آئے
کب اس پھلواری سے نکلے بھنوروں کی بارات

○

جب جھرنے مین چاند نہائے
چاند پہ نیلا بادل چھائے
کنول کنول اپنے نینوں میں کوئی بھید چھپائے
رات پجارن بن کر آئے
دیپ پہ دیپ جلائے
پانی مین آکاش سمائے
نیم پہ پنچھی گائے -
پانی اور آکاش پہ تیرا پرتو سا لہرائے
میرے من کو ہولے ہولے جگ سندرتا گھائے
میں لپٹوں مڑ جائے مجھ سے میں جھپٹوں اُڑ جائے
کوئی بھید نہ پائے تیرا کوئی بھید نہ پائے

رات کروٹ بدل رہی ہے دیکھ
تیری زلفوں میں ڈھل رہی ہے دیکھ

اور اک ساغرِ خمار آگیں
زندگانی سنبھل رہی ہے دیکھ

بہ صراحیٔ بادہ ہی اکثر
تیرا نعم البدل رہی ہے دیکھ

حسنِ گل میں کمی نہیں لیکن
زندگی خوں اُگل رہی ہے دیکھ

رنگ لائے گی کیا یہ روحِ عصیر
کشت و خوں مین جو پل رہی ہے دیکھ

جامۂ کوہ کن میں روحِ جبر
اک نئی چال چل رہی ہے دیکھ

ظلمتِ زیست سے اُلجھتا رہ
شمعِ تقدیر جل رہی ہے دیکھ

اک سحر کی تلاشِ پیہم میں
زندگی آنکھ مَل رہی ہے دیکھ

پرچمِ عزم کو بلند کر اور
وہ مشیّت رسی ٹل رہی ہے دیکھ

○

آج مستِ مئے وصال ہیں ہم
صد صنم خانہ، خیال ہیں ہم

تار و پودِ حیاتِ انساں سے
اک اُلجھتا ہوا سوال ہیں ہم

ایک وا ماندہ مُسکراہٹ ہیں
خستہ تن ہیں تباہ حال ہیں ہم

ہر زمانے کی ناشناسی سے
زخم خوردہ ہیں باکمال ہیں ہم

حسرت آمیز ہے نگاہِ آیاز
محوِ نیرنگِ ماہ وسال ہیں ہم

○

دیکھ منزل بہ کفِ غُبار آلود
چند راہی ہیں کارواں میں ہم

اک فلک بوس عزم کی خاطر
مِل گئے مجمعِ جہاں میں ہم

لہلہاتے چمن لبوں پہ لئے
مسکراتے رہے خزاں میں ہم

اک مہکتا ہوا تسلسل ہیں
تیری زُلفوں کی داستاں میں ہم

رات بھر کھوئے کھوئے رہتے ہیں
تیری یادوں کی کہکشاں میں ہم

○

رنگ و بُو کا غُبار ہوتے تھے
پا بہ جولاں بہار ہوتے تھے

ہائے وہ رات جب ترے گیسو
سانس میں مشکبار ہوتے تھے

ہائے وہ صبح جب ترے عارض
قاصدانِ بہار ہوتے تھے

ہائے جب گردنِ محبّت میں
آرزوں کے ہار ہوتے تھے

ملگجی چاندنی کے سایے میں
وقفِ صد انتظار ہوتے تھے

آج مرجھا گیا ہے اپنا دل
ہم خدائے بہار ہوتے تھے

اب وہ آہنگِ قلب ایاز کہاں
اک مچلتی ستار ہوتے تھے

○

ہائے میں کون ہوں کہاں ہوں میں
اک تحیّر بھری فغاں ہوں میں

خوشہ چینانِ عیش پھرتے ہیں
محوِ نیرنگِ گلستاں ہوں میں

یوں تری آرزو مہکتی ہے
جیسے پھولوں کے درمیاں ہوں میں

غم نہ کر اس جہانِ تیرہ میں
چاندنی ! تیرا پاسباں ہوں میں

اَے اسیرانِ شب بغور سنو
اس کی زُلفوں کی داستاں ہوں میں

○

ہر زمانے میں پھول کھلتے ہیں
رنگ و بو کی کمی نہیں ہوتی

ایسی راتیں بھی کاٹ لی ہیں جب
چاندنی چاندنی نہیں ہوتی

کیسی مے ہے یہ تلخیٔ غم میں
آج کوئی کمی نہیں ہوتی

اے تبسّم فروش محبوبہ
ہر لگن، دل لگی نہیں ہوتی

مکرِ یاراں پہ فرطِ حیرت سے
چشمِ غم میں نمی نہیں ہوتی

بجھ نہ جائیں اُمید کی شمعیں
تیرگی ختم ہی نہیں ہوتی

غم نہ کر جاں نثارِ حُسنِ گُل
کفِ جاناں تہی نہیں ہوتی

ذکرِ رخسارِ یار سے عاری
شاعری شاعری نہیں ہوتی

پھُول توڑے تھے کچھ بہاروں میں
خلشِ نوکِ خار باقی ہے

اَے مہکتے ہوئے لبو! آؤ
میرے ہونٹوں میں پیار باقی ہے

ہے قسم اُس ملیح چہرے کی
میرے دل میں نکھار باقی ہے

کارروانوں کو ڈھونڈنے والا
ایک اُڑتا غبار باقی ہے

تم کو دیکھا، ہنسا، پر آنکھوں میں
اشکِ بے اختیار باقی ہے

اب وہ راتیں کہاں ایازؔ مگر
یادِ گیسوئے یار باقی ہے

○

سارے قصّے تمام کر دیتے
زندگی غرق جام کر دیتے

تیری زُلفوں پہ مے چھڑکتے اور
صبح ہوتے ہی شام کر دیتے

تیرے ہونٹوں پہ منتقل اپنا
جذبۂ انتقام کر دیتے

غمِ دَوراں کا مضحکہ اُڑتا
غمِ جاناں کو عام کر دیتے

اُن کی چلتی تو حضرتِ زاہد
ہر تبسّم حرام کر دیتے

○

زیست کے جامِ تہی میں روز و شب
بادہ اپنا اپنا بھر لیتے ہیں سب

سُن تو زاہد میں نے توبہ کی تھی جب
چاندنی راتیں نہ تھیں جیسی کہ اَب

زندگانی کی غزل کے چند شعر
تیری آنکھیں تیرے عارض تیرے لَب

بہرِ شاعر صد صحیفہ ایک چاند
صد پیمبر اک سکوتِ نیم شب

دے گئی کوئی شعارِ زندگی
اِک مئے کہنہ مرے ہونٹوں کو جب

میں غزل خواں ہو گیا پھر سے ایاز
جھومنے گانے لگا شہرِ طرب

○

سمن بروں سے سرِ رہگزار ملتے ہیں
اگرچہ مثلِ نسیم بہار ملتے ہیں

نہیں ہے منزلِ آخر جہانِ آب و گِل
نہ سوچ دوست کہ ہم بار بار ملتے ہیں

ہزار جبرِ زمانہ سہی مگر ہم لوگ
کسی حسین سے بہ اختیار ملتے ہیں

○

آتی ہے یاد صورتِ جاناں کبھی کبھی
ہوتا ہے میرا دل بھی گلستاں کبھی کبھی

اس کشتیٔ شکستہ کو حسرت سے دیکھ کر
آیا ہے یاد منظرِ طوفاں کبھی کبھی

صورت بدل گئی ہے غمِ روزگار کی
بکھری ہے یوں بھی زُلف پریشاں کبھی کبھی

کتنی ہی راتیں میں نے بنائیں سدابہار
آغوش میں رہا مہِ تاباں کبھی کبھی

بھٹکا رہا ہے ایاز سرابِ حیات میں
اے دوست مثلِ چشمۂ حیواں کبھی کبھی

دلِ افسردہ کی تمنّائیں
وہ سراپا بہار کیا جانے

جو گھٹاؤں کی روح پر گزری
پندِ پرہیزگار کیا جانے

تیرے قدموں کی بے نیازی کو
سجدۂ رہگزار کیا جانے

موجِ مے پہ رواں ہے کشتیٔ عمر
حسنِ معصومِ یار کیا جانے

بادلوں کی اُڑان پر رونا
ساکنِ شہرِ یار کیا جانے

خلشِ حسرتِ گناہ پہ مری
تیرا پروردگار کیا جانے

صبح دم جب ہم چمن میں آگئے
مثلِ شبنم برگِ گل پر چھا گئے

ہے ازل سے زندگی ساغر بدوش
رند کیا کیا میکدے چھلکا ئے

جھک گئی جب وہ نگاہِ شرمگیں
ہم ترے حسنِ طلب کو پا گئے

خاکِ پائے حُسن بن کر ہم ایاز
کائناتِ بے کراں پر چھا گئے

○

جلد آجا کہ رات ہوتی ہے
ہر خوشی بے ثبات ہوتی ہے

تیرے ہونٹوں کو دیکھ کر مجھ کو
آرزوئے ثبات ہوتی ہے

تیرے ہونٹوں میں بھینی بھینی سی
بوئے آبِ حیات ہوتی ہے

پھول جھڑتے ہیں مے چھلکتی ہے
کیا تیری بات بات ہوتی ہے

جو تری زُلف میں اُلجھتی ہے
بس وہی رات رات ہوتی ہے

گوشۂ خلوتِ محبّت میں
وسعتِ کائنات ہوتی ہے

شاعری ایاز کیا کہنا
اُن کے ہونٹوں کی بات ہوتی ہے

○

سازِ ہستی کی جیت ہیں ہم لوگ
اک محبّت کا گیت ہیں ہم لوگ
میرے آکاش کے دھنی دیکھو
اپنی دھرتی کی میّت ہیں ہم لوگ

○

بڑی پُر کیف شب تھی ملگجی تھا چاند کا مکھڑا
نہ جانے اس رہینِ روزنِ زنداں پہ کیا گزری
تمھیں معلوم ہے تاریکی و تنہائیٔ شب میں
تمہاری کوک سے کویل، دلِ انساں پہ کیا گزری

○

فطرتِ حُسن حُسنِ فطرت ہے
چاندنی سی رنری طبعیت ہے

○

پھول پر پرتوِ خزاں سا ہے
تیرا محوِ خیال ہو جانا

وہ شبِ ہجر میں بسا اوقات
چاندنی کا وبال ہو جانا

میری تقدیر کا تسلسل ہے
تیری زُلفوں کا جال ہو جانا

اب یہ حالت ہے عشق پر ہنسنا
اور سراپا خیال ہو جانا

خاکِ پروانۂ جُنوں کا ہائے
دودِ شمعِ خیال ہو جانا

حاصلِ جستجوئے پیہم کیا
منتہائے نجات کیا معلوم

موجۂ خواب پر رواں ہیں ہم
ابتدا ہے نہ انتہا معلوم

پھول کھلتے ہیں تا کہ جھڑ جائیں
مدّعائے صبا خدا معلوم

○

میکدے میں ترا مہینوں سے
چاندنی انتظار کرتی ہے

عارضِ یار کو نظر میری
کس نفاست سے پیار کرتی ہے

ہر جگہ کوئی بوئے آوارہ
جستجوئے بہار کرتی ہے

تجھ کو میری تلاشِ حسنِ ازل
کس عقیدت سے پیار کرتی ہے

دیکھ یہ نرگسِ خمار آلود
پھر مجھے بادہ خوار کرتی ہے

دیکھ یہ موجِ عشقِ ساحل مست
پھر مجھے ہم کنار کرتی ہے

گردشِ جام کو تر و تازہ
گردشِ روزگار کرتی ہے

○

اُلجھنے لگیں مشعلیں آندھیوں سے
سُلجھنے لگی کاکلِ شب رفیقو
مگر جب رفیقو
سحر ہو گئی   زندگی سو گئی
عزم خیبر شکن آہنی جان و تن
پنجۂ خواب میں موم سے ہو گئے
مشعلیں بجھ گئیں پاسباں سو گئے
اور نوعِ بشر کو یقیں ہو گیا ہے
کہ نورِ سحر تا ابد یونہی رخشاں رہے گا۔
مگر یہ تو دستورِ روز ازل ہے
شب و روز اک دوسرے کا تعاقب کریں گے
رفیقو نئی مشعلیں ڈھونڈھ لاؤ
شبِ تیرہ و تار سوئے زمیں پھر سر افشاں ہوئی ہے

تخلیقِ فن

پھر کوئی سنگ بدست آتا ہے
خانۂ شیشہ گراں کی جانب
پھر کوئی نعرۂ مستانہ بڑھا
لرزشِ کوئے اماں کی جانب

پھر کوئی شبنمِ تخیّل لئے
چہرۂ گُل پہ مہکنے آیا
پھر کوئی فطرتِ قندیل لئے
صبحِ کاذب میں دہکنے آیا

پھر کوئی گردنِ مینا پہ جھکا
پھر لبِ جام کسی نے چومے
پھر نہاں خانۂ اصنام کھلا
پھر صنم زندہ ہوئے اور جھومے

پھر نگاہِ صنم افروز کوئی
سینۂ سنگ میں پیوست ہوئی
پھر کوئی تشنگیٔ صہبا ساز
تہہِ ساغر میں چھلکتی پہنچی

پھر جٹاؤں میں گھٹائیں جھومیں
اور کوئی میکدہ بر دوش آیا
لبِ فردا پہ تبسم نکھرا
جب کوئی مستِ مئے دوش آیا

متلاطم ہوئی وہ تاریکی
جس کی گہرائی نہ ہوگی معلوم
ماہ و انجم کے حروف زرّیں
جس کی ہر موج پہ ہوں گے مرقوم

○

آرزوؤں کے پھول چُن لینا
قصّہ ہائے بہار سُن لینا
اور مہکتی ہوئی فضاؤں میں
سُنتے سُنتے مدام سو جانا
ہے یہی اختتام سو جانا

سچل سرمست

وہی موج و تلاطم ہے وہی اپنا سفینہ ہے
مسلسل ہے حیات اپنی نہ مَرنا ہے نہ جینا ہے
دیارِ کفر و ایماں ہے سنبھل کر چل ارے ناداں
یہاں تو فرطِ نفرت ہے یہاں تو شرطِ کینہ ہے
ریائے زہد کیوں اس کے قریب آئے کہ میرا دل
شرابِ زیست میں ڈوبا ہوا اک آبگینہ ہے
ترا حُسنِ خُمار آگیں سرِ بازار لے آئے
یہی اَپنا سلیقہ یہی اَپنا قرینہ ہے
در و دیوارِ مسجد زاہدِ زنداں طلب کے ہیں
مرا تو مہ بہ مہ انجم بہ انجم ایک زینہ ہے
سحر پھُوٹی ریائے زہد پھر سے کُو بکُو نِکلا
سچو اب تک مری آنکھوں میں کیوں خوابِ شبینہ ہے

سچلؔ سرمست

شعارِ خاص سے اُلجھے شعورِ عام سے اُلجھے
ہمارا مسلک پرواز کس کس دام سے اُلجھے
صبا جب زُلفِ جاناں کا پیامِ مشکبُو لائی
کبھی ہم کفر سے اُلجھے کبھی اسلام سے اُلجھے
سرِ منزل شعورِ پا شکستہ کھویا کھویا سا
بسا اوقات اپنے ہی خیالِ خام سے اُلجھے
سچؔو ہر کیف و مستی کفر ہے اس بزمِ ہستی میں
یہ دورِ جام کب تک گردشِ ایّام سے اُلجھے

سچل سرمست

راہِ طلب میں
طبلِ تمنّا گُونج رہا ہے

اہلِ سلاسل چنگ بہ لب زنجیر بہ پا ہیں
سارے غرفۂ زنداں وَا ہیں
شور بَپا ہے
سازِ نفس ہر ضربِ صبا سے
وَلولہ خیز آہنگِ صدا ہے
سینۂ گیتی شعلہ نوَا ہے
طبلِ تمنّا گُونج رہا ہے
راہِ طلب میں

لو اَب سارے رشتۂ ہستی ٹوٹ چکے ہیں
اہلِ سلاسل چھوٹ چکے ہیں
دیکھ یہ کیا ہے
فرشِ زمیں سے عرشِ بریں تک
اک طرفہ سیلابِ ضیا ہے
جس میں عالم ڈوب گیا ہے
طبلِ تمنّا گُونج رہا ہے
راہِ طلب میں

سچل سرمست

کون ہوں میں کون ہوں ؟

ہاں بتا اے شعبدہ بازِ حیات

کیا ہے تیری کائنات

اک طلسمِ بے ثبوت و بے ثبات

اور میری جاں مثالِ لعبتِ رنگیں صفات

جس میں رقصاں تیری ذات

کون ہوں میں کون ہوں ؟

قصرِ مَرمَر ہے یہ انساں کا بدن

ہے چراغِ نو اسی میں ضو فگن

اور اسی میں مشعلِ دورِ کہن

پردہ ہائے تیرگی میں روشنی کے صد کرن

ایک گوشہ بہر یزداں ایک بہرِ اہرمن

چار سُو ہوں کاخ و کو میں خیمہ زن
کون ہوں میں کون ہوں ؟

مثلِ گُل ہوں اور مری خوشبُو ہے تُو
یا سرابِ آرزو ہوں اور رمِ آہو ہے تُو
موجِ پیچاں ہوں کنارِ جُو ہے تُو
سایۂ مہتاب ہوں میری حقیقت تُو ہے تُو
دشنۂ تقدیر ہوں میں جنبشِ اَبرو ہے تُو
کون ہوں میں کون ہوں ؟

میں خرابِ کفر و ایماں میں اسیرِ ننگ و نام
میں شعارِ گبر و ترسا میں شعورِ خاص و عام
کہکشاں پر ہے کبھی میرا مقام
اور کبھی چہرے پہ گردِ صبح و شام
ہر تصوّر ہر تخیّل زندگی سے انتقام
اے سمندِ ناز کی لُوٹی زمام
کون ہوں میں کون ہوں ؟

چین رلے ساآمی

صبحِ ازل سے شامِ ابد تک ایک تسلسل تیرا میرا
میرا تحیّر موجِ پریشاں تیرا تلوّن وسعتِ دریا
غرفۂ گل سے دیدۂ شبنم جانبِ انجم جھانک رہا ہے
ذوقِ نمو ہو رنگ و بو ہو بھور بھئی تو سب کچھ سپنا
کالی کالی رین پیا تو میں کویل کی کوک بنی ہوں
ایک صدا ہوں ایک نوا ہوں تیری گونج تری ہی مہما
ناچ رہی ہوں ناچ رہی ہوں تیرے دوارے ناچ رہی ہوں
من میں آشا آنکھ میں سپنا پیر میں گجرا ہاتھ میں مالا
شام ہوئی مدہ ماتا ساآمی پگ پگ دیپ جلاتا ساآمی
کس کے دوارے جا نکلا ہے لٹ چھٹکاتا روتا گاتا

ساتھی

وہ دیکھو شبنم روتی ہے اور ساری دنیا سوتی ہے
ہر حرماں اپنا درماں ہے ہر آنسو اپنا موتی ہے
اک شب ایسی بھی ہوتی ہے جب چاند پہ پیار آجاتا ہے
جب چاند سے وحشت ہوتی ہے اک شب ایسی بھی ہوتی ہے
وہ نیند جو اُڑتی رہتی ہے وہ آنکھ جو روتی رہتی ہے
وہ اس دھرتی کی شوبھا ہے وہ اس جیون کی جوتی ہے
ہے ایک حقیقت دُکھ سُکھ کی اس جیون کی پھلواری میں
جو غنچہ ہنستی ہے اور شبنم شبنم روتی ہے
یہ کیسی کو ملتا کی لَو ہے تیرے میرے بندھن میں
جو تیرا مَن برماتی ہے اور میری آنکھ بھگوتی ہے

اس چار پہر کی چھایا میں اَے چاند کبھی تُو نے سوچا
کیا تیری ہستی پاتی ہے کیا تیری ہستی کھوتی ہے
پھر سے وہ ترنّم ریز صدا جو راگ بھی ہے بیراگ بھی ہے
جو سوگ بھی ہے اور جوگ بھی ہے جو داغ عصیاں دھوتی ہے
تو پاپی ہے تو پاپی ہے اے سامی کیسا پاپ مگر
جب پاپ اُسی کا پرتو جو تیرے من کا موتی ہے

ساگر

اک پھول سے جوبن پر بھونرے جب منڈلاتے ہیں گاتے ہیں
ہم اپنی بیتی رتیوں کی خوشبوؤں میں کھو جاتے ہیں
یہ نین سجل، یہ پتلے پتلے ہونٹ پیا کے امرت سے
ہر گیان سے بہتر ہوتے ہیں ہر دھیان پہ جب چھا جاتے ہیں
یہ جیون، نیند کی موجوں پر اک سپنے سا اٹھلاتا ہے
پھرتا بہ ابد ہم ایک اندھیرے ساگر میں کھو جاتے ہیں
ہے اپنی مکتی پریت پیا من جیت لیا جگ جیت لیا
وہ راکھ نہیں ہو پاتے جو اس اگنی میں جل جاتے ہیں
پھر صبح ہوئی پھر شام ڈھلی اس دکھ کی ہیرا پھیری میں
ہم کیا ہیں کیوں دکھ پاتے ہیں ہم کیا ہیں کیوں دکھ پاتے ہیں

اِن کو نہ جگا اِن کو نہ جگا اَے گیانی جا جا تیرا کیا
یہ مدھ پی کر کھو جاتے ہیں یہ پاپی نیند کے مَاتے ہیں
دُکھ سامی اک دیو داسی ہے جس سے اپنے من مندر میں
پوجا کر کے پریم پجاری جیون بھر جی بہلاتے ہیں

سامی

جنم جنم کی راکھ کریدی ملی نہ وہ چنگاری
نیل گگن کے ہر باسی سے پوچھا تیرا بھید
پوچھ ذرا چندا سے میں نے کیسے رات گزاری
پھول پھول میں ڈھونڈی میں نے وہ بھینی بُو باس
اس جیون کی پھلواری میں گھوما کیاری کیاری
کرتا ہے میری کوتا میں جگ مگ جگ مگ کون
بول بول میں گن ہیں کس کے جاؤں واری واری
آنکھ مچولی کھیلنے والے آ بھی جا تو آج
پاؤں کھوؤں، کھوؤں پاؤں کب تک میں دکھیاری

ساقی

پھر رات ڈھلی پھر دیپ بجھے اک عالم نیند کا ماتا ہے
پھر میرا پاپی من مجھ کو مدھ پینے پر اُکساتا ہے
میں کیسے تجھے سمجھاؤں سکھی وہ پھولوں کی کوملتا ہے
میں ایک مہک بن جاتی ہوں جس وقت سجن گھر آتا ہے
وہ گاؤں کی گوری پنگھٹ پر جس وقت مٹکتی آتی ہے
ہر تیاگ لرزنے لگتا ہے بیراگ بہت بل کھاتا ہے
یہ پریت یہاں کی پریت نہیں ہے تیرے میرے بندھن میں
اک دور دور کا بندھن ہے اک جنم جنم کا ناتا ہے
میں اپنے من میں اک سورج کی کھوج لگائے رہتا ہوں
جب رین اندھیری ہوتی ہے جب نیل کمل کمہلاتا ہے
جو جنم جنم بھٹکاتا ہے اور نئے نئے دُکھ دیتا ہے
یہ ساقی مدھرا پی کر کیوں اُس پاپی کے گن گاتا ہے

ساحی

سلسلۂ لامتناہی میں آخر کب وقفہ ہو گا
جینا بھی دکھ، مرنا بھی دکھ، سکھ کیا جانے کیا ہو گا

آشاؤں کے میلے میں بھی من کے میت اکیلے ہو
اس جیون میں کون اے پریتم تجھ جیسا تنہا ہو گا

پاؤں تلے آ کر اک کیڑا جب دب جاتا ہے سجنو
اس سنسار میں کوئی مخفی حشر بپا ہوتا ہو گا

جوگی کی پہچان بتاؤں کان پھٹے لٹ چھٹکے سے
دریا دریا آنکھیں اس کی، من صحرا صحرا ہو گا

رات گئے یہ باہر گونجی کس کی میٹھی میٹھی تان
من مورکھ اٹھ بیٹھ کہ در پہ وہ جوگی بابا ہو گا

کبھی کبھی آکاش پہ کوئی محوِ تجسس نکلے گا
اس کا مکھڑا بھی اے چندا تیرے مکھڑے سا ہو گا
رس کے لوبھی بھونرے ہیں سب جیون کی پھلواری میں
لیکن دیکھو ساحی گزراں مثلِ بادِ صبا ہو گا

میر عبدالحسین سانگی

پھر وہی بادِ بہار آنے لگی
جسم و جاں سے بوئے یار آنے لگی

بدلیوں کی چھاؤں میں کیا بات تھی
یادِ جاناں بار بار آنے لگی

رُوح کی گہرائیوں سے دفعتاً
کوئی کھوئی سی پکار آنے لگی

پھر گھٹاؤں سے لپٹ کر سُوئے جام
گردشِ لیل و نہار آنے لگی

میری آنکھوں سے برسنے کے لئے
کوئی رسمِ انتظار آنے لگی

مدّتوں کے بعد سانگی آج پھر
زخمِ پنہاں پر بہار آنے لگی

(۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۸ء تک)

○

بادلوں کی طرح طوفانوں کی زد میں ہے ابھی
ردّو کد میں ہے ابھی
خطۂ برِّصغیر
پھر بھی میری آرزو کے
حلقۂ قوسِ قزح میں ہے اسیر
اور میں
شاعرِ اوّل ہوں اُس کے حُسن کا
اور میری شاعری
جیسے عیسیٰ کے لبوں پر شیرِ مریم کی لکیر
اک نئے دورِ محبّت کا خمیر
ہاں یقیناً وہ دن آئے گا کہ جب
ختم ہو گی یہ فضائے دار و گیر

نسلِ نَو کا جاگ اُٹھے گا ضمیر
اور میں
شاعرِ اوّل ہوں اُس کے حُسن کا

○

اَے سوالِ پُر خطر
اَے پُرانے نقب زن !
کتنے برسوں تک لگائی تُو نے سیند
لیکن اس دیوارِ لب میں
کر نہ پایا اک شگاف !
اب کوئی فکرِ گرفتاری نہ کر
ڈھا ہی دے یک لخت اس دیوار کو
اس مسلسل جانکنی کو ختم کر
بے کلی کو ختم کر
خامشی کو ختم کر

○

(قبرستانِ مکلی میں)

قصۂ حاتم نہیں یہ ایک سچّی بات ہے

گوش برآواز ہو

سُن کہ مٹّی بولتی ہے

"جام نندو! کب تلک سوتے رہوگے؟"

دیکھ دریاخان دولہہ کا مزار

ہل رہا ہے

اور یہ آواز پھر آنے لگی ہے

"جام نندو! کب تلک سوتے رہوگے

سر پہ سُورج آگیا ہے

رزم گاہِ زندگی میں

غلغلہ ہی غلغلہ ہے

کب تلک سوتے رہو گے

نیند میں روتے رہو گے،

آ کہ ہم سنگِ لحد کو توڑ دیں

آ کہ پھر جینے سے رشتہ جوڑ دیں"

تاجدارِ سندھ جام نندو اور ان کے سپہ سالار دریا خاں دونوں دفاعِ وطن کے لئے لڑتے ہوئے مارے گئے۔

○

اے خریدارِ حقیقت

محوِ حیرت ہو گئے ؟

سوچتے ہو ہار کے موتی کہاں سے لایا ہوں !

سچ ہے، تیری سوچ میں یہ بات آ سکتی نہیں

دار کے تختے پہ ہنس کر اُس علمدارِ بغاوت

نانتیا ٹوپے نے، جو آنسو بہائے تھے کبھی

میرے دامن میں گرے تھے میرے ہی حصّے میں آئے تھے کبھی

لیکن اے نا آشنائے اہلِ جرأت

سچ ہے تیری سوچ میں یہ بات آ سکتی نہیں

○

(سندھ صدیوں سے)

رہنے والا ہوں رفیقو

اُس دیارِ درد کا

جس کے صدیوں کے علمبردار سب مارے گئے

سوہنی دھرتی پہ سب وارے گئے

کچھ مورخ آج پھر تہ خانۂ تاریخ میں

جھانکتے ہیں

خاک اُس کی پھانکتے ہیں

چاکِ پرچم ٹانکتے ہیں

بال سر کے نوچتے ہیں

اور پھر یہ سوچتے ہیں

پرچموں سے خون کے دھبے مٹانے چاہئیں
صاف ستھرے پرچموں کے واسطے
کچھ بہانے چاہئیں

○

اَے بھٹائیؔ
پیر و مرشد !
اے اسیرِ حسنِ ذات
بے نیازِ رنگ بوئے کائنات
اے ثباتِ بے ثبات
میں کہ ہوں محوِ صفات
اس طلسمِ ہا و ہُو میں روز و شب
بے سبب اور بے ادب
کائناتِ بے کراں کو مسترد کرتا تھا میں
ردّ و کد کرتا تھا میں
آج پھر میں تیرے در پر آ گیا ہوں
ہدیۂ فہم و فراست لایا ہوں

اَے بھٹائیؒ

پیرو مرشد!

ہے غمِ جاناں حقیقت

اور غمِ دوراں حقیقت

اور بالاتر سبھی سے

ہے غمِ انساں حقیقت

اب مگر میں مانتا ہوں اک غمِ بے نام بھی ہے

اور بامعنی و مقصد تیرا ہر پیغام بھی ہے

آج تم سے فیصلہ کر کے اُٹھوں گا

جامِ صحت تیرا میں بھر کے اُٹھوں گا

اَے بھٹائیؒ

پیرو مرشد!

متفق ہے تو کہ ہر تخلیق سے ہے خوب تر

کائناتِ بے کراں میں زندگانیٔ بشر

پرتوِ حسنِ ازل ہے
بے بدل ہے
جانتا ہوں میں کہ ہے یہ بے ثبات
اور یہ کامِ نہنگِ کائنات
روز و شب اُس کو نگلنے پر تُلا ہے
ایک دروازہ کھُلا ہے
جس سے جا کر کوئی لوٹ آتا نہیں
پھر دیارِ درد میں جاتا نہیں،
اَے کہ تارِ عنکبوتِ کائنات
سے ہے واقف تیری ذات!
تُو کہ اسرارِ ازل سے آشنا
یہ بتا
کیا کسی انساں پہ انساں کے ستم کا ہے جواز؟
اے شناسائے حقیقت اور دانائے مجاز

آج میں ظُلم و سِتم سے برسرِ پیکار رہوں
جب کبھی فرصت ملی تیار رہوں
تیرے بحرِ بیکراں میں دور جانے کے لئے
اور دلِ حیراں میں اک غوطہ لگانے کے لئے

○

اَے تصنّع کے امین !

فرق تیرا اور اپنا جانتا ہوں

جانتا ہوں میں کہ تیری شاعری

چاہِ نخشب سے اُبھرتا چاند ہے

اور میری شاعری

جیسے موہن[1] جو دڑو پر ہو طلوعِ آفتاب

اے تصنّع کے امین !

مانتا ہوں میں کہ تیری شاعری

ہے ردیف و قافیہ سے آشنا

ہاں مگر تیرا تخیّل

اک فریبِ دیدۂ نابین ہے

---

[1] صحیح تلفظ موہن جو دارو نہیں بلکہ موہن جو دڑو ہے

○

آج پھر پُروا چلی
پھر جُگوں کی پریت یاد آنے لگی
میں تجھے پھر ڈھونڈھتا ہوں اُروشی[1]
میں کہ وکرم بھی ہوں کالی داس بھی
آج پھر تیرے لئے بے چین ہوں
تیرے بالوں کی سُگندھ سے پرے
میں کویتا لکھ تو لیتا ہوں مگر
اس تعفّن سے بھری دنیا پہ مَیں
چادرِ مشکیں سجاؤں بھی تو کیا
پریت کے کچھ گیت گاؤں بھی تو کیا

---

[1] کالی داس کے ڈرامہ وکرم اُروشی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے

ہائے کتنی تیز ہے بوئے کفن
ہائے کتنی تنگ ہے کوئے وفا !
کاش مجھ کو چھوڑ کر جاتی نہ تو
مجھ سے ناتا توڑ کر جاتی نہ تو !

تجھ سے دُور، کدم کے اُوپر
نیلے نبھ میں چاند —
پہچانے پھُولوں کی پگ پگ
سُوندھی موہک باس
بنسی کی تانوں سے من میں
ایک انوکھی پیاس
کیوں اُن سب کو چھوڑ کے مُورکھ
اپنایا بنواس ؟
میری نگریا میں جو آئے
سب کچھ کھو کر تم کیا پائے
میں کیوں تیری باتیں سُن کر

اپنے من کو روگ لگاؤں ؟
تیرے بھیانک سپنے کو میں
کیوں اپناؤں ؟
اپنی نیند بھری آنکھوں کا
چین اڑاؤں ؟
میرے نیم پہ ٹھک ٹھک کر کے
نیل کنٹھ کو تو نے اُڑایا
اور مرے اِکتارے کو کیوں
ٹھوکر ماری کیا ہاتھ آیا؟
چین نہ پاؤ گے مرنے تک
کچھ پہچانو اپنا پرایا
اَب بھی واپس جاؤ مورکھ

اَپنوں کو اَپنا تُو مورکھ
آج بھی ہے پہلے سا سُندر
تجھ سے دُور، کدم کے اُوپر
نیلے نبھ میں چاند ——

○

بھور بھئی اور پنچھی جاگے
اُجیارے نے انگڑائی لی۔
اوس میں بھیگی کلیاں جاگیں
نیند میں ڈوبی گلیاں جاگیں
گائیں جاگیں گوالے جاگے
دھرتی کے رکھوالے جاگے
اب کرنوں کی باگیں تھامے
پُورب کا رتھ وان بڑھے گا
اور جیون کی بھن بھن باتیں
دن بھر کانوں میں گونجیں گی
چاند کے چرنوں میں ہی میں نے

گاتے ساری رین گزاری
دُنیا سوئی اور میں جاگا
دُنیا جاگی، میں سو جاؤں
اب تو وینا پر سر رکھ کر
میٹھے سپنوں میں کھو جاؤں
اب تم میرے گُن اور اوگن
بیرن دھرتی بھول ہی جاؤ
مٹی سے کیا بَیر رکھو گی؟
میری بَلا سے اب ٹھکراؤ
یا مرے گیتوں کو اپناؤ
میں نے تم کو معاف کیا ہے
اَب میں چَین سے سو جاؤں گا

○

دور کیلاش سے
چاند ہیمنت[1] کا
میرے من کو ہمیشہ بُلاتا رہا
میں کہ رنبیر تھا
تو میں لڑتا رہا
برچھیوں کے تلے
جھپکیاں نیند کی
مجھ کو راس آگئیں
رن پہ سورج کے نکھ[2]
جب چمکنے لگے
میں نے چہرہ نہ ان سے چھپایا کبھی
زیست تانبا بنی

---

[1] ہیمنت

میرے تلوے جلے

برچھ کی چھاؤں میں میں نہ بیٹھا کبھی
گھاؤ جب بھر گئے میرے ہر انگ پر
کتنے کالے گلابوں کے پودے ملے
بَیریوں نے کبھی یہ شکایت نہ کی
میں نے لڑتے ہوئے وار اوچھے کئے
مارنے سے کبھی ہچکچاہٹ نہ تھی
اور نہ مرنے کا ڈر
ہاں مگر
رن کی جلتی ہوئی ریت پر
دور کیلاش سے
چاند ہیمنت کا
میرے من کو ہمیشہ بُلاتا رہا۔

موسم سرما ۲ؔہ نکھ۔ ناخن

○

میری بچی مسکراتی انکھڑیوں سے
دیکھتی ہے اپنی ماں کو
جیسے روزِ آفرینش
شاخِ طوبیٰ پر شگوفہ
دیکھتا ہو موجۂ تسنیم کو
چند لمحوں کے لئے میں ہر امید و بیم کو
طاق غفلت پر بھلا کر کھو گیا ہوں
اور پھر یہ سوچتا ہوں
میں کہ تاریخی تسلسل کی صدائے کن فکاں
میں ہوں پابندِ سلاسل
اور اپنی بیڑیاں

کھڑکھڑاتا جا رہا ہوں
لڑکھڑاتا جا رہا ہوں
سوئے روزِ آفرینش
بطنِ ہستی میں ہے جو ابتک نہاں
کھینچتا رہتا ہے میری روح کو
آدمِ نو کا بہشتِ بے گماں
سوچتا ہوں
اس شگوفے کو کنارِ موجۂ تسنیم پر
چھوڑ کر جاؤں اگر
مجھ پہ الزامِ جفا تو آئے گا
ہائے کتنے لوگ ہیں میرے وطن میں باشعور
جانتے ہیں جو وفا کی وسعتِ کونین کو

بھور ہوئی ہے
آک کے نیلے پھول کھلے ہیں
سوکھی ہوئی دھرتی کی آنکھیں کتنی آس لگائے
دیکھ رہی ہیں ساون رُت کی آنے والی گھٹاؤں کو
تپتے ہوئے رن کی دھرتی پر چھانے والی چھاؤں کو
ان پھولوں کی موہنی آنکھیں کتنی سُندر لگتی ہیں
سب کے من کو ٹھگتی ہیں
کس نے دیکھا برسوں کا رس ان کی نیلی نس نس میں
کس نے سوچا سورج ان پر کب تک بان چلائے گا
کرنوں کو برسائے گا
پاگل ہے پچھتائے گا

اپنا کس بل کھوئے گا
آخر ڈوب ہی جائے گا
وہ کیا جانے
زہر میں ڈوبی نیلی آنکھیں دھوپ میں کب کمہلاتی ہیں

قحبۂ دورِ کہن
روکشِ آئینۂ حالِ وطن
رنگ و روغن سے تو کچھ بنتا نہیں
تیرے چہرے کی ٹھٹھرتی جھرّیاں
گرمیٔ حُسنِ جواں
پا نہیں سکتی کبھی
قحبۂ دورِ کہن
بے نیازِ قیل و قالِ انجمن
کیا زلیخا نام رکھ کر
دامنِ یوسف کو ہتھیانے چلی ہے
قحبۂ دورِ کہن

۵

سوچ کچھ، اتنا نہ بن
یہ نقاب سبز تیرے زرد چہرے کو چھپا سکتا نہیں
کچھ سیاسی بے حیاؤں کے سوا
اب نئے گاہک بنا سکتا نہیں —

عشق میں نے بھی کیا ہے یارو
لیکن اس دورِ ستم میں مجھ کو
حرفِ بے معنی و مقصد سے سروکار نہیں
نسلِ انساں کی افزائش کے
ایک پہلو پہ ہزاروں اشعار
کوئی دیوانہ ہی کہہ سکتا ہے
تھر کے تپتے ہوئے صحرا میں ببول
ایک مدت سے ہیں بانہیں پھیلائے
بدلیاں دور سے آتی ہیں چلی جاتی ہیں
اور میں گرمِ سفر ہوں کب سے
میرے پاؤں میں پھپھولے بڑھ کر

ریت پر سرخ لیا زوںؒ کی طرح لگتے ہیں
پیاس میں سوکھ گئی ہے یوں زباں
شاخِ تھوہر پہ ہوں کانٹے جیسے
ہاں کئی سال ہوئے
میں نے پایا تھا اُسے چشمۂ شیریں کی طرح
اُس کے نینوں میں ہراساں تھے ہرن
اور باہوں سے گھٹا ساون کی
موسلا دھار برسنے کے لئے اُٹھی تھی
اب وہ اک پھول سا بچّہ لے کر
سوچتی ہوگی کہ کب لوٹے گا
میری آغوش کو بھرنے والا
مجھ کو جانا ہے بہت دُور ابھی

ؒ بیر کی طرح ایک سرخ پھل

دُور ہے دُور بہت کارونجھر

جس پہ موروں کے دیئے

جب چمکتے ہیں سرِ شام تو یوں لگتا ہے

رام بنواس سے لوٹ آیا ہے

عشق میں نے بھی کیا ہے یارو

لیکن اس دورِ ستم میں مجھ کو

حرف بے معنی و مقصد، سے سروکار نہیں

؎ کارونجھر۔ نگرپارکر کا ایک پہاڑ

○

(قرضِ منصور)

دورِ منصور کئی سال ہوئے ختم ہوا
جی میں آئی ہوئی ہر بات کیا کرتے تھے
تختۂ دار سے ہم لوگ کہاں ڈرتے تھے
نعرۂ حق سے ستونِ مقتل
کانپ جاتے تھے اچانک دلِ قاتل کی طرح
اور پھر قاتلِ سفّاک نے یہ حکم دیا
"سرفروشوں کی زبانیں اِکدم
کاٹ دو دشنۂ عیّاری سے"
دورِ منصور کئی سال ہوئے ختم ہوا
کرمکِ چوب بنے اور ستونوں میں چھپے
(کتنا مشکل ہے صدائے دل کا)

گوشۂ انساں سے کنارہ کرنا)

چشمِ قاتل سے نہاں
اب شب و روز ستونوں میں رہا کرتے ہیں
کاٹتے رہتے ہیں مقتل کے رگ و ریشے کو۔
چُور ہو جائیں گے اک دن یہ ستوں اندر سے
ایک دن ایسا ضرور آئے گا۔
جب یہ مقتل کی گرانبار فصیلیں کٹ کر
دھم سے گر جائیں گی ناگاہ سرِ قاتل پر
کرمکِ چوب نکل آئیں گے
اپنے بے خواب نہاں خانوں سے
اور اک رقص طربناک بپا کر دیں گے
قرضِ منصور کو یک لخت ادا کر دیں گے

○

آج کتنی گرم لُو چلنے لگی ہے
اور میرے خشک لب
شاخِ تھوہر کی طرح سوکھے ہوئے ہیں
کون جانے نیل کنٹھ
آج کن سوکھے درختوں میں چھپا ہے
اور مینا سوچتی ہے
اس فضائے آتشیں میں راکھ ہو جائیں گے پر
اس سے بہتر ہے کسی کے پنجرے میں بند ہونا
اور کویل اُڑ گئی ہے
اک دیارِ ابرِ باراں کی طرف
ہاں فقط
چند کرگس کھا رہے ہیں لاش کو
اور اُن کا پیٹ بھرتا ہی نہیں

○

اَے معرّی

اَے مرے خرگوش سُن !

تیری عظمت کا تو میں منکر نہیں

میں سمجھتا ہوں کہ ہیں فوق البشر

تیرے جیسے ہی اہنسا کے پجاری

احترامِ زندگی کرتے ہیں جو —

ہاں مگر یہ بھیڑئے

یہ درندے

روز و شب چنگھاڑتے اور چیرتے

منکرانِ احترامِ زندگی

کھینچتی ہے جن پہ میری شاعری

اپنی تیغِ بے نیام
اُن کا کیسا احترام !
اور کبوتر کو بچانے کے لئے
کاٹ لیتا ہوں اگر شاہیں کے پر
منطقی تکمیل تیری بات کی کرتا ہوں میں

پھر سے اورنگ زیب اور خوشحال خاں
کوئے جنّت میں مقابل آ گئے
اک فرشتے سے کہا خوشحال خاں نے
"کوثر و تسنیم کے کنٹھوں پہ میں
کب تلک گاتا رہوں اپنی غزل
مجھ کو اک شمشیر دے دو
لو یہ سب طوبیٰ کے پھل "

اب تک میرے من میں کبیرا پیت کا دھاگا کاتتا ہے
جنم مرن کے بیچ میں ندیا
اب تک بپھری ناگن بن کر
زور سے لہریں مارے
یہ دھاگا اک پل ہے پیارے
اس نفرت اور خوف کی دنیا
میں یہ دھاگا
راکھی بندھن بن سکتا ہے
آؤ پریم دوارے
آؤ بجھاؤ
بیتی باتوں کے انگارے
اب تک میرے من میں کبیرا پیت کا دھاگا کاتتا ہے

○

مَنش وہی ہے
اپنے کئے پر جو پچھتائے
اور پسُوہٹ کرتے ہیں
کیا کانٹوں کے ڈھیر پہ کوئی
خود ہی پھُول کھِلے گا بھائی
پربیت کا ناتا توڑ کے تجھ کو
کیسا موکش ملے گا بھائی

محل، دو محلے، کاریں، نوکر
یہ سب کچھ تو پایا تُو نے
چار کھِلونے لے کر مورکھ
اپنا جنم گنوایا تُو نے

پنچھی چھوڑے، پیڑ بسارے
ندی نالے کھوئے تُو نے
اور غصّے سے بہتے آنسو
اس دَھرتی میں بوئے تُو نے

ایک پُرانی پُستک لے کر
کتنی اکڑ فوں کرتے ہو تم
اس دھرتی کے گیان سے لیکن
من ہی من میں ڈرتے ہو تم

میری کویتا کے شبدوں میں
جنم جنم کا بندھن پاکر
کتنا شور مچاتے ہو تم
کل سے میرے دوارے آکر

میں نے سارا چین لٹا کر
اِک سپنے کو مول لیا ہے
مجھ سے اِتنا کیوں چڑتے ہو
تجھ کو تو بِن مول دیا ہے

اَب تک مجھ کو دُکھ ہے بھائی
تیرے ٹوٹے ہوئے درپن کا
مجھ سے بدلہ کیوں لیتے ہو
اپنے من کے بھدّے پن کا

مَنش وہی ہے
اَپنے کئے پر جو پچھتائے
اور پسُوہٹ کرتے ہیں

○

سندھ میرے وطن

میں تری پیڑ پر سوچ کر

ایک گہرے سمندر میں ہوں غوطہ زن

ڈوب جاتا ہے تیرہ تلاطم میں دل

عصرِ حاضر ہے یا موجۂ بے کفن

ہاں اُبھر کر کبھی دیکھ لیتا ہوں میں

موجِ غم سے ترا ساحلِ بے نشاں

ڈوبتی کشتیاں

اور پھٹے بادباں

اور مانجھی کہ منجھدار کو جانتے ہی نہیں

اور اپنی سکانوں کو پہچانتے ہی نہیں

دُور مشرق سے اُٹھا ہے طوفاں سا
یم بہ یم آرہا ہے تغیّر لئے
دم بدم پھیلتا از کراں تا کراں
کون جانے مجھے وہ اُچھالے کہاں
کون جانے تُرا ساحلِ بے نشاں
میرے پاؤں کو چومے اچانک کبھی
میرے ہونٹوں پہ اک مسکراہٹ رکھلے!

○

گو اَنا الحق تو نہیں کہتا ہوں میں
اور نہ میں منصور ہوں
دار پر دارین کو وارے ہوئے
سوئے مقتل جا رہا ہوں
مسکرانا
گیت گانا
اے مرے جلاّد کیا تو جانتا ہے
کون سی وحدت کا دعویٰ کر رہا ہوں
کس حقیقت کے لئے میں مر رہا ہوں !

○

قاضی القضات نے
کل یوں اورنگ زیب سے کی گفتگو
"سرمدِ مستِ اَلست
قافیہ پیما تو ہے
اُس کو مَروانا ضروری تو نہیں"
اِس پہ اورنگ زیب نے ہنس کر کہا
"ہر رُباعی اُس کی اِک تلوار ہے
جس کی نوکِ بے اَماں
قافیے پر ختم ہوتی ہے بظاہر
در حقیقت میری گردن کاٹتی ہے

○

نسلِ نو !
تو سایۂ ابلیس میں
جب ہوئی پَل کر جواں
میں نے اک تصویر تیرے سامنے
لا کے رکھی دفعتاً انسان کی ۔
تو نے حیراں ہو کے دیکھا اور کہا
"یہ تو اک ابلیس ہے
پھاڑ دو اس بد نُما تصویر کو"
سوچتا رہتا ہوں تب سے
انقلابِ دید کیسے لاؤں میں
نسلِ نو کو کیسے یہ سمجھاؤں میں
کون سا ابلیس ہے
اور کون سا انسان ہے

O

کوچۂ جاناں کی جانب جو گلی جاتی تھی اب سنسان ہے
کل ہزاروں لوگ تھے جو لے کے اپنا چنگ و دف
ناچتے گاتے چلے تھے صف بہ صف
اُن گلوں کی خامشی اب شاکیٔ سرطان ہے
موڑ پر اب خشم آگیں اک بڑا عفریت ہے
زندگی کے غلغلے پر خامشی کی جیت ہے
تم تو کہتے ہو کہ اس عفریت سے
اک نئے عفریت کو ٹکرائیں ہم
غلغلہ برپا کریں کچھ اپنا جی بہلائیں ہم
سوئے مستقبل ہراساں دیکھ کر
سوچتا ہوں میں مگر
وہ نیا عفریت اس سے بھی برا ہو تو کہاں ہم سر چھپائیں
اُس گلی میں کیسے جائیں!

○

اک خموشی قعرِ غم میں غوطہ زن
رو کشِ روئے حسیناں
اک منّخنث زندگانی کا چلن
خاکِ پروانہ پہ خنداں
بے نیازِ دُودِ شمعِ انجمن
جرأتِ رنداں پہ حیراں
ساغرِ ہستی سے منہ پھیرے ہوئے تاشنہ دہن
اپنی موجِ بے حسی میں ڈوب کر
اپنی دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھے بادبانِ فکر وفن
اِک خموشی جُرمِ آزادی کی پاداشِ گراں
گردنِ ناآنا سرِ دار و رسن

ازسرِ نو نعرہ ہائے بے اماں کی پرورش کرتی ہوئی
بطنِ دوراں میں نہاں جہدِ وطن
خلوتِ بے انجمن
اِک ہجومِ بے کراں کو ساتھ لینے کے لئے
غرقِ موجِ اضطرابِ جان وتن۔
یہ خموشی زندگی ہے
وہ خموشی موت ہے

○

کیا تم میرے ساتھ چلوگے ؟
سُورج جب تپ جائے گا تب اک ہی چِتا میں ساتھ جلوگے ؟
میری عمریا بیت گئی ہے
مجھ کو تو کانٹے ہی ملے ہیں
لیکن میں نے مان لیا ہے
اُس بگیا میں لال بھبھو کے پھُول کھلے ہیں
کٹھن ڈگر پر کیسی چھاؤں !
لہولہان ہیں میرے پاؤں
پھر بھی میں بڑھتا جاتا ہوں
دیکھو کیسے چٹانوں پر میں دھیرج سے چڑھتا جاتا ہوں
اب تو پہاڑوں کے پیچ و خم میرے لئے انجانے نہیں ہیں
اور اکیلے پن کے سبب غم میرے لئے بیگانے نہیں ہیں

اَے پردیسی تم رستے میں آن ملے ہو
میری طرح تم بھی وہ بگیا ڈھونڈھ رہے ہو
جس میں کروڑوں لال بھبھوکے پھول کھلے ہیں
میری عمریا بیت گئی ہے
مجھ کو تو کانٹے ہی ملے ہیں
کٹھن ڈگر پر کیسی چھاؤں
اور نازک ہیں تیرے پاؤں
کیا تم میرے ساتھ چلو گے؟
سُورج جب تپ جائے گا تب اک ہی چِتا میں ساتھ جلو گے؟

○

گورے سانپ بلوں میں بھاگے
آزادی کے نام پہ ہم کو
کالے سانپ ملے
کاٹ وہی پھنکار وہی ہے
اپنی ہریالی دھرتی پر
سانپوں کی یلغار وہی ہے

امرت میں بِس گھولنے والے
اِن سانپوں کے چند سپیرے
رُوپ کے اُجلے من کے کالے
اس بستی میں ڈال کے ڈیرے

اب تک پڑھتے ہی رہتے ہیں
جھوٹے منتر سانجھ سویرے

سچ کی لاٹھی ٹوٹ چکی ہے
اُس کو پھر سے جوڑ لو ورنہ
تیری قسمت پھُوٹ چکی ہے

گورے سانپ بِلوں میں بھاگے
آزادی کے نام پہ ہم کو
کالے سانپ ملے ۔

بارشیں ہوں گی، رہِ ہستی پہ تھم جائے گی دھول
اور دونوں سمت گہرے سرخ پھول
جب کھلیں گے
تب ملیں گے

تا اُفق جس وقت ہوگی اک فضائے سُرخ رنگ
اپنے کاشانوں کو لوٹیں گے کُلنگ
سب ملیں گے
تب ملیں گے

تیرے میرے آنسوؤں میں ایک طوفاں آئے گا
دیکھتے ہی بعد سب مٹ جائے گا
کب ملیں گے
کب ملیں گے

○

باز آیا میں ترے نروان سے شاکیہ مُنی
سُکھ نہ ہوں گے
دُکھ نہ ہوں گے
اک خلائے بے کراں میں آتما کھو جائے گی
کیا یہی تم کو مِلا ہے
عمر بھر کے تزکیہ کا یہ صِلا ہے ؟
جنم کے چکر سے چھوٹے
بُلبُلے کی طرح پھُوٹے
اے مرے پیغمبرِ والا صفات !
جنم کے چکر سے ہی ہے رنگ و نورِ زندگی
ہر سرورِ زندگی
کائناتِ بے کراں میں رُوپ کیا دھاروں گا میں

ایک برگِ سبز پر نروان کو واروں گا میں
گر مجھے ہو اس پہ کوئی اختیار
اس زمیں پر آؤں گا میں بار بار
کھیلتے بچّوں کی یہ کلکاریاں
اور سندر ناریاں
جن کے ہونٹوں میں کٹے انجیر کی لالی، مٹھاس
آتما کی بھوک پیاس
چہچہاتی آرزوئیں لہلہاتی زندگی
مجھ کو اس دھرتی پہ پھر لے آئے گی
تا ابد اک تیرگی یا روشنی، جو کچھ بھی ہو
دُکھ نہ ہوں
اور سُکھ نہ ہوں
ہستیٔ پایندہ ہو یا نیستی، جو کچھ بھی ہو
کُلبلا جاتا ہوں اس امکان سے شاکیہ مُنی!

○

اب تو سورج ڈھل رہا ہے

پربتوں میں

تھک گئے ہیں اُس کے پاؤں

پھر بھی کوئی چل رہا ہے

پربتوں میں

ریت کے ٹیلے پہ یہ جو

اک دیا سا جل رہا ہے

پربتوں میں

اک نئے سورج کا سپنا

اس دیئے میں پل رہا ہے

پربتوں میں

آنے والا دن ابھی سے
اپنی آنکھیں مَل رہا ہے
پربتوں میں

○

خونِ انساں بہہ رہا تھا کل یہاں
اب تو بھنگی دھو گئے ہیں راستے کو
خونِ انساں نالیوں میں جم گیا ہے !

ہاں یہاں کل خونِ انساں بہہ رہا تھا
اور سب سے کہہ رہا تھا
میں کہ چاول اور مچھلی سے بنا ہوں
نغمۂ ٹیگور بھی ہوں
اور سُگندھوں میں پلا ہوں
مجھ سے اک ماتھے پہ ٹیکا تو لگاؤ
اس طرح میں رائیگاں جانے نہ پاؤں !

○

کیوں تم مجھ کو چھیڑ رہے ہو؟

اب تو بھول چکا ہوں میں اُن مدھ ماتے نینوں کی باتیں
یاد دلاتے ہو کیوں مجھ کو بھولی بسری پریت کی راتیں
اس جیون کے کٹھن ڈگر پر چھاؤں نہ ہوگی ان باتوں سے
کیسی ٹھنڈک چاہتے ہو تم بھولی بسری برساتوں سے

پگ پگ جلتے پاؤں دیکھو
سر پر آگ برستی دیکھو
بوند بوند کو میری دھرتی
اک مدت سے ترستی دیکھو

جلنا بھی ہے چلنا بھی ہے
دُور بہت منزل ہے ساتھی
میں نے کب انکار کیا ہے
میرا بھی اک دل ہے ساتھی

اس جیون کے کڑے کوس میں جب بھی جوانی یاد آتی ہے
اک ہرنوں کی ڈار نظر آتی ہے اور پھر کھو جاتی ہے
مدھ ماتے نینوں کے بادل چاروں اور اُمنڈ آتے ہیں
بسری بیت کے کتنے سپنے گھور گگن میں کھو جاتے ہیں

لیکن اس سے کیا ہوتا ہے
سر پر آگ برستی دیکھو
بوند بوند کو میری دھرتی
اک مدّت سے ترستی دیکھو
پاؤں بڑھاؤ ساتھی ہم کو
چلنا بھی ہے جلنا بھی ہے
اس جیون کے لمبے دن کو
جلتے جلتے ڈھلنا بھی ہے
کیوں تم مجھ کو چھیڑ رہے ہو !

○

بے تحاشا صبح و شام
ریڈیو، اخبار، ٹی وی بک رہے ہیں
روکشِ حالِ عوام
رات دن پیغام پہنچانے کے بعد
مخبرانِ پر شکستہ کابکوں میں لوٹتے ہیں

درپئے سودائے خام
کچھ محقق صدیوں کی قحبۂ ژولیدہ مو کو
شانۂ تحقیق سے آراستہ کرنے چلے ہیں

زیرِ تیغ بے نیام
اَب فسانہ گو مثالِ شہرزاد
ہر شبِ غارت کو اپنے مکر و فن سے ٹالتے ہیں

اور شعرائے کرام
اہلِ دل کی ہڈیوں کے ڈھیر کو
سنگ و آہن کی فصیلیں باندھتے ہیں
مثلِ موج بے خرام
ہم کہ ہیں ساحل نشینوں سے پرے
ورطۂ غم سے ابھر کر سوچتے ہیں
ہر حلالی لفظ سے اپنا مقام
فاشیت کے دور میں کتنے حرامی اصطلاح
ڈھیٹ پن سے چھینتے ہیں
بے تحاشہ صبح و شام
ریڈیو، اخبار، ٹی وی بک رہے ہیں

○

وہ گرا ، دھم سے گرا
خون میں لت پت ہو گیا
اور ابد تک سو گیا
ایک شاعر مر گیا
بزدلانہ وار اپنے دور پر یوں کر گیا
خودکشی کی ، ڈر گیا
پھاند کر دیوار اپنے گھر گیا
لوگ اُس کو چور سمجھے ۔
کیا دہانِ گور سمجھے
پوپلے پن میں یہ کیسی کپکپی ہے !

تم کہ نے ہو
ایسی شے ہو
ساز بن سکتی ہے جو
میرے ہونٹوں کی ابدتک
مُرتعش آواز بن سکتی ہے جو
اک سراپا راز بن سکتی ہے جو
سوچتا ہوں تجھ کو اپنے سانس سے گرماؤں میں
تیرا پیکر نغمہائے سرمدی بن جائے گا
لمحۂ عشق پر افشاں اک صدی بن جائے گا
سوچتا ہوں گاؤں میں
تیرے آغوشِ ترنّم کو ذرا برماؤں میں
تم کہ نے ہو
میں کہ لے ہوں

دامنِ آتش فشاں میں یہ جوا خانہ تو دیکھ
حرصِ زر میں ہر ادائے بے حجابانہ تو دیکھ
ہر کسی کی چشمِ مے گوں مثلِ پیمانہ تو دیکھ
اور جوّا لا کر اپنے جی میں ہے ٹھانے ہوئے
اور کماں تقدیر کی تانے ہوئے
کون جانے کب پھٹے گا
آتش و آہن کے تیروں میں بٹے گا
کب فسونِ شب ہٹے گا
کب ہٹے گا، کب ہٹے گا!

○

خاک کو سرسبز کرنے کے بغیر
ابرِ نیسانِ بہار
یوں گزرتا ہے چمن سے بار بار
تشنہ گانِ زیست سے جیسے اُسے ہو کوئی بَیر
میری چشمِ آبدیدہ کو کرے گا کون سَیر؟
خوشۂ انگور سا میرا جگر
آبیاری کر رہی ہے جس کی چشمِ اشکبار
ہاں مگر یہ میری آہِ بے اثر
بار ہا یوں ہو گئی ہے منتشر
تاک کو سرسبز کرنے کے بغیر
جس طرح وہ ابرِ نیسانِ بہار۔

○

قوم نے تیری قدر نہ کی، یہ سوچتے ہو

کیوں اپنے پَر نوچتے ہو؟

اپنی صلیب سے آزردہ ہو؟

اُس کو پھینک کے دیکھو تو

اک دَم کاندھے جُھک جائیں گے

جُھک جائیں گے۔

لوح و قلم سے بھاگتے ہو؟

ہاتھوں کو مفلوج کرو گے؟

کیا اتنا تاوان بھرو گے؟

قوم جو تیری قدر کرے تو یہ سمجھو

تم اور تمہاری سب تحریریں
لوح و قلم کی یہ تقدیریں
پنساریوں کے کام آئیں گی
پڑیا پڑیا بٹ جائیں گی

○

اَے پرندو! انھیں بتاؤ کہ میں
بوڑھے برگد کی چھاؤں سے کتنا
اپنے بچپن سے پیار کرتا ہوں
اپنی رگ رگ کو ریشے ریشے کو
ان جڑوں پر نثار کرتا ہوں
اے ہواؤ! انھیں سناؤ کہ میں
ریگِ صحرا پہ برق و باراں کو
اپنے اجداد کی طرح اب تک
سجدہ بے اختیار کرتا ہوں
اپنی دھرتی کے دیوتاؤں میں
بادلوں کو شمار کرتا ہوں

چاند جب چیت کے مہینے میں
اپنی کرنیں بکھیر دیتا ہے
کتنی صدیوں کی سرحدوں کو میں
ایک لمحے میں پار کرتا ہوں
پوس میں اوس بھیگی کلیوں پر
میرے من کو اُداس کرتی ہے
میں کہ اک صبح کا جوانی سے
آج تک اِنتظار کرتا ہوں
سوچتا ہوں سفید بالوں کے
تارِ سیمیں بِکھر نہ جائیں کہیں
مجھ کو خوابوں کا خوں بہا نہ ملے
اور ویرانۂ حقیقت میں
پھُول کوئی کِھلے، کِھلے نہ کِھلے

ایک دن کہکشاں کی ڈولی میں
زندگی الوداع کر جائے
اور مری شاعری بھی میرے ساتھ
خاکِ صحرا پہ یوں بکھر جائے
جس طرح گرد میں بگولوں کے
پھول جھڑ جاتے ہیں ببولوں کے

○

آج کیوں پھول لانے لگے
اور عقیدت کی شمعیں جلانے لگے
میری برسی منانے لگے!

جاؤ جی جاؤ جی!
اپنی بیوی کے رانوں پہ ہاتھوں کو گرماؤ جی
اس کا سینہ نگاہوں سے برماؤ جی
اب اشاعت گھروں میں کتابیں مری کوئی چھاپے تو کیا
راکھ پر ہاتھ تاپے تو کیا
مجھ کو پیمانۂ وقت ناپے تو کیا
خاک سے لو لگائے تو کیا
میرے بسرے ہوئے گیت گائے تو کیا
پھول لائے تو کیا

اب تو آدھی صدی ہو گئی ہڈیوں کو ٹھٹھرتے ہوئے
قبر پر گاؤں کی چاندنی کو بکھرتے ہوئے
اوس کے آنسوؤں کو بکھرتے ہوئے

اب مجھے انتظارِ شناسِ سخن ہی نہیں
پاسِ فن ہی نہیں
کوئی اپنے لئے حسنِ ظن ہی نہیں

○

باہنہ ٹہنی سی تھی ہاتھ تھا پھول سا
میری محبوبہ کا
چاندنی جم گئی رات پالا پڑا
پھر بھی نکھرا رہا اس کا رنگِ حنا
ہاتھ تھا پھول سا
میری محبوبہ کا

میرے گھوڑے کی باگوں پر آکر رُکا
ہاتھ وہ پھول سا، کوئی کہنے لگا
تم کہاں جارہے ہو سلونے پیا؟
میں تو سننے لگا تھا سموں کی صدا
رَن سے آتی ہوئی سنسناتی ہوا
اس کو چھوتی رہی، میں چلا ہی گیا

اب تو لڑتے ہوئے شام ہونے لگی
اور لہو کی لہک رنگ کھونے لگی

لاشیں بکھری ہوئی ہیں کئی ریت پر
ایک سوکھے ہوئے کھیت پر
میں کھڑا سوچتا ہو کہ کیوں جھڑ گیا
ہاتھ وہ پھول سا
میری محبوبہ کا!

○

ساقِ سیمیں کی نیم عریاں کئے
طاقِ نسیاں پہ جب میں سجانے لگا
میرا ہمزاد مجھ کو بُلانے لگا
"اِتنی جلدی بھی کیا اے مرے بوالہوس
چہچہاتے پرندے ابھی تک ترا
ڈھونڈتے ہیں قفس
شامِ گلرنگ کو جام میں ڈھال دے
عمرِ وارفتہ کو تتلیوں کے لئے
اک نیا جال دے
یہ سوانح نویسی تری خبطِ بے رنگ ہے
وقت تو تنگ ہے
پھر بھی لکھنے پہ جینے کو ترجیح دے"

پات جھڑنے لگے رُت بدلنے لگی
اب مری رنگ و بُو سے لدی شاعری
ایک چمپا کا سُوکھا ہوا برچھ ہے
کون جانے کہ کب اس میں پھُول آئیں گے
اور سکھیوں کے جھرمٹ مری سمت بالوں کو لہرائیں گے
اُن کے جوڑوں میں گجرے مری باس مہکائیں گے
اُن کے ہاتھوں میں لپٹی ہوئی میری رنگت سروں پر گھڑوں
میں مہک جائے گی
اور پنگھٹ پہ کوئل جو کوکے گی تو کوک اُس کی مہک
میں چہک جائے گی
پھر کلاؤں کے در پر جوانی بہک جائے گی
کون جانے کہ پھر اک نئی رُت مری شاعری کے لئے آئے گی
ور چمپا کا سُوکھا ہوا برچھ پھولوں سے لد جائے گی

○

جانتا ہوں کہ وہ وقت آئے گا
جب مری شاعری کو اچانک کبھی
چاند آکاش گنگا میں نہلائے گا

جانتا ہوں کہ وہ وقت بھی آئے گا
جب زباں کا تعصّب نہ ہوگا کہیں
میری خوشبو سے ہر اک مہک جائے گا

جانتا ہوں کہ وہ وقت بھی آئے گا
جب نگر اور ڈگر ایک ہو جائیں گے
میرا آدرش جب مجھ کو اپنائے گا

جانتا ہوں کہ وہ وقت بھی آئے گا
میری مدفون مٹی پہ روؤ گے تم
کوئی راہی مرا گیت جب گائے گا

○

جل رہے ہیں نگر
جل رہے ہیں ڈگر
پھول مرجھا گئے
پات جھڑنے لگے
یہ گھڑی یہ گھڑی
کیسی آئی کڑی
کوئی ساون جھڑی
کوئی ساون جھڑی!

اَے گرج اَے کڑک
دے دلوں کو دھڑک
بادلوں کے دھنی

ہاں پہن لے مری
آنسوؤں کی لڑی!
کیسی بپتا پڑی
کیسی بپتا پڑی!
پھول مُرجھا گئے
پات جھڑنے لگے

O

میرے دیدہ ورو
میرے دانش ورو!

پاؤں زخمی سہی ڈگمگاتے چلو
راہ میں سنگ و آہن کے ٹکراؤ سے
اپنی زنجیر کو جگمگاتے چلو

روکشِ نیک و بد
کتنے کوتاہ قد
سر میں بادل لئے
ہیں تہیہ کئے
بارشِ زہر کا
اک نئے قہر کا

میرے دیدہ ورو
میرے دانش ورو!
اپنی تحریر سے
اپنی تقدیر کو
نقش کرتے چلو
تھام لو ایک دم
یہ عصائے قلم
ایک فرعون کیا لاکھ فرعون ہوں
ڈوب ہی جائیں گے

○

اُس کا دام نہ پوچھ اَے آمر
اُس کے گیت خرید سکو گے؟

آج تری دہلیز پہ ہر سُو
بھک منگوں کا شور بپا ہے
جو کوڑی کے بھاؤ نہ بکتا
لعل و گوہر کے مول بکا ہے

بارشِ سیم میں تیرا تبسم
کاسۂ رخشاں دستِ گدا ہے
علم و ادب بازارِ کنیزاں
حسنِ برہنہ عشوہ نما ہے

دولتِ دانش جرأتِ بینش
فکر کہ فن ہو، سب کی بہا ہے
تیرے دیارِ دام و درم میں
اک شاعر کی قیمت کیا ہے ؟

لیکن تو نے آمرِ ناداں
چاروں اور کبھی دیکھا ہے
سندھ کہ اک دریائے خوں ہے
نبضِ تپانِ دشتِ وفا ہے
اُس کی وادیٔ گریاں میں اب
اک ایسا بھی شعلہ نوا ہے
جس کی صدائے بانگ جرس پر
ایک انوکھا رقص بپا ہے
زنجیروں میں ناخنِ پا پر
اک طرفہ سارنگ حنا ہے

رسمِ تپیدنِ خاک وخوں سے
اُس نے جب بھی شعر کہا ہے
دیواروں سے دھول اُڑی ہے
شہرِ سلاسل کانپ اُٹھا ہے

گیت گرجتا نعرہ بن کر
بستی بستی پھیل گیا ہے
موہن جو دارو کی دھرتی
آج لپکتا سا شعلہ ہے
یہ شعلہ جس رقصِ شرر کی
ایک تحیّر خیز ادا ہے

اُس کا نام نہ پوچھ اَے آمر
اُس کے گیت خرید سکو گے ؟

○

(امیر خسرو پنہاری سے)

"تیرا ناؤں ؟"
"کانتی"
"تیرا رُوپ انوپ ہے"
"میرا رنگ نہ روپ ہے"
"تیری صورت سانولی
تو کیا جانے باولی
من منڈپ کی آگ ہے
تیری کایا کانتی"

"میرا ناؤں کانتی
میرا بھیس بنارسی

تیری بولی پارسی
میری بولی پوربی
اور میں پوجوں مورتی
تیرا من گھنگھور، میں
چندر ماں کی شانتی "

" شترو سمجھ نہ کانتی
یہ میرا بھی دیس ہے
کتنا گہرا گیروا
میرے تن کا بھیس ہے
تیرے میرے گاؤں کا
اپنا اپنا تھانولا

لیکن ان کے بیچ میں
پانی تو ہے ایک سا
میری اچھّی کانتی
میں تو ہوں ویدانتی"

مکھ پر ڈالے کیس ابھاگن دھرتی جب سو جاتی ہے
کھسرو رونے لگتا ہے
چندا ہے آکاش پہ یا برہن کی بیاکل چھاتی ہے
کھسرو رونے لگتا ہے
پیپل کی ڈالی پر بچھڑی کویل شور مچاتی ہے
کھسرو رونے لگتا ہے
اس دھرتی کے بھاگ نرالے روتے رونے گاتی ہے
میرے من میں جو کھسرو ہے نین بھگوتا رہتا ہے
گھر جانے کی بات کرو تو بے بس روتا رہتا ہے

○

پرتگال کے رہنے والو!
جوئے خوں میں بہنے والو!
کل کی بات ہے جب تم نے ٹھٹھ میں آگ لگائی تھی
اور میرے لب پہ دہائی تھی

تاریخ نے پلٹا کھایا ہے
مجبوروں کو محکوموں کو
اس دھرتی کے مظلوموں کو
آج ایسا غصّہ آیا ہے
وہ میرا بدلہ بھی لیتے ہیں
انگولا کے رستوں پر
اور موزنبیق کی گلیوں میں

دھرتی پہ چٹکتی کلیوں میں
جو سُرخ تبسّم ملتا ہے
وہ میرے زخمی ہونٹوں پر
اب دھیرے دھیرے کھلتا ہے

پرُتگال میں رہنے والو!
جوئے خوں میں بہنے والو!

سندھ کی خون آلودہ صدیوں کو میں جیسے بھول چکا ہوں
سرخ پھریرے کے نیچے میں تیرے گبرو دیکھ رہا ہوں
جن نے اپنا خون بہا کر
سامراج کے خونی دھبّے دھو ڈالے ہیں
تخت و تاج کے خونی دھبّے دھو ڈالے ہیں
میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر

اُن کو لال سلام کیا ہے
سندھ دیس کے بھولے بسرے
بولوں میں اک گیت دیا ہے

سچ کے ساتھی انسانوں میں بُعد نہیں ہے
اس شعلے کے پروانوں میں بُعد نہیں ہے

پرتگال کے رہنے والو
جوئے خوں میں بہنے والو
کل کی بات ہے جب تم نے ٹھٹھہ میں آگ لگائی تھی
اور میرے لب پہ دُہائی تھی

○

اپنی ساڑھی کو یوں سمیٹے ہوئے
کار سے وہ اُتر کر آئی ہے
جیسے لمسِ جذام ہو دھرتی

اُس کی جادو بھری نگاہوں سے
دم بخود ہے ہجومِ ناہنجار
موج کی سرخوشی ہے پاؤں میں
اور چہرے پہ ہے کنول کا نکھار

اب کسی بیکری سے کیک اُٹھائے
اپنے بٹوے کو کھولتی ہے تو
دیکھتی ہے کہ کوئی پاؤں بڑھائے
اپنے ہونٹوں میں ایک ہوک دبائے

اُس سے اپنی نگہ ملاتا ہے
ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتا ہے

اُس کے آنتوں میں بھوک کی ناگن
اُس کے ہاتھوں سے سر اُٹھاتی ہے
کاٹنے کے عظیم جذبے کو
بھیک کے واسطے دباتی ہے

مسکرا کر وہ اپنے بٹوے سے
اک چونّی نکال لیتی ہے
اور کہتی ہے، "یہ چونّی لو

ہاں مگر اس سے چرس کی گولی
آج تم مت خریدنا بچّے!"

پھر دَبے قہقہے کا چہرے پر
ایک سیمیں نقاب ڈالے ہوئے
وہ دُکان دار کو لُبھاتی ہے

○

پھر آج اندھیری گلیوں میں
تم مجھ کو چھوڑ کے جاتی ہو

یوں ہونٹ ترے ہونٹوں سے ملے جس طرح ہوا میں کلیاں ہوں
ہم دونوں رس کے لوبھی تھے منہ جیسے شکر کی ڈلیاں ہوں

ہم اس نیلے آکاش تلے جس وقت ملے پہچان لیا
اس جنم جنم کے ناتے کو آنکھوں آنکھوں میں جان لیا

میں ڈھونڈھ رہا تھا جس پایل کو گھر گھر گاؤں گاؤں میں
وہ کیسے چھنکتی آنکلی اے پیاری تیرے پاؤں میں

یہ کیسی ترشنا تھی نینوں کے مرگھ اکٹھے کر پائی
اور ساون ساون جھڑیوں میں من موروں کو یوں لے آئی

ہے یوں ہی پیت کی ریت رہی یہ پیت بھی پل کی پیت رہی
گھور اندھیارے پر جگ مگ کی یہ جیت بھی پل کی جیت رہی
کیوں ناتا توڑ کے جاتی ہو؟

پھر آج اندھیری گلیوں میں
تم مجھ کو چھوڑ کے جاتی ہو

○

پریم دِوانی میراں روئے
اَب تک شیام نہ آئے

اُس کو کوئی کیسے بھُولے
آنگن آنگن بیلا پھُولے
ہاں اک سُدھ سُگندھ نہ آئے
سُورج ڈوبا جائے

برہا کوئی بھول ہو جیسے
سانجھ نھئے گو دھول ہو جیسے
دور کدم پر کویل کوکے
منوا چین نہ پائے

سانوریا! میں کب ہاری ہوں
اب تک تم پر بلہاری ہوں
پاؤں تو اب تک ناچ رہے ہیں
نین یوں ہی بھر آئے

پریم دوانی میراں روئے
اَب تک شیام نہ آئے

○

لوگ کہیں میراں بھئی باوری
ساس کہے کُل ناسی رے

(میراں بائیؒ)

تو کس دھرتی کا باسی رے
کیسا چکور رہے کب آئے گی
تیری پور نماسی رے!
تیری کویتا بھئی باوری
لوگ کہیں کُل ناسی رے
کیسا دیپ جلایا جس کی
جوت بنی جگ۔داسی رے

کیسی ذین ملی ہے تجھ کو
جنم جنم کی پیاسی رے
اَپنے من میں ڈوب کے دیکھا
کیا کعبہ کیا کاسی رے

ایک دیوالی کہ تیری لَو نے دی
اے مرے خسروؔ کہ دلّی سے کراچی تا بہ ارضِ تاشقند
پھینکتی ہے روشنی کی اک کمند
اور حصارِ تیرگی کو بے حذر
پھاندنے لگتے ہیں تیرے ارجمند
یک زباں ہو کر چراغوں کی لویں
پوچھتی ہیں اک سوالِ درمند
"کب تلک یہ روشنی پر قید و بند"

(لطیف اور خسروؔ)

دو دیپ جلے
اک جمنا ماں کے کنٹھے پر
اک سندھو ماں کے صحرا میں
دونوں میں انوکھی پیت کی لو
دونوں میں انوکھے پھول کھلے
دونوں کو ہواؤں کی زد میں
ہم چھوڑ کے نکلے تھے لیکن
وہ لو نہ بجھی وہ پھول نہ اب تک مرجھائے
اور روشنیوں کی بت جھڑ میں
وہ دیپ نہ اب تک کمہلائے

ہاں اُن کی روشن خوشبو میں

ہم اب تک رستہ ڈھونڈتے ہیں

جس پیت ڈگر سے بھٹکے تھے

اُس پیت ڈگر کو لوٹتے ہیں

○

اِس سمت بھٹائی گلیوں میں
کل خون میں لت پت دیکھا تھا
اُس سمت بھی اک ہنگامہ تھا
اِک خنجر اُس کے سینے میں
پیوستہ ہوا، وہ آن گرا
اور میں نے اپنی جھولی میں
جب اس کے زخم کو سہلایا
تو کیا دیکھا، وہ خسرو تھا
اِس سمت بھی میرا گرم لہو
اُس سمت بھی میرا گرم لہو

کیوں پانی بن کر بہتا ہے ؟
تاریخ کے خونی سقا کو
تم کب تک خون بہاؤ گے
اور کب تک یہ لہراؤ گے ؟
یہ میری زباں یہ اُن کی زباں
ہے ایک ہی لوری دونوں کی ماں
لوری جو خاموش زباں سے
اس دھرتی کی کوکھ سے نکلے
نئے جنم کو تکتی ہے

آنے والا کل دیکھو جب سُرخ سویرا ہوگا
ہم اور خسرو ایک ہی صف میں ساتھ دکھائی دیں گے
دھرتی ماتا کے بیٹوں کا میل انوکھا ہو گا
چور اُچکّے آنے والے کل سے دور چھپیں گے

آنے والا کل کہ اٹل ہے جس کی ٹکر کوئی نہیں
آنے والا کل کہ لہو کے دریاؤں سے گزرا ہے
روکنے والے! آنے والا کل تو کہیں ٹھہرا ہی نہیں
ٹوکنے والے! جو بھی کہو تم آنے والا آتا ہے

آنے والے! کل کا خسرو ایک چمکتا سورج ہے
جس کے دیئے کی لَو میں اپنے من میں جلائے رکھتا ہوں
صدیاں بیتیں آنے والے کل کی نرالی سج دھج ہے
اپنے سارے گیت اُسی کی بھینٹ چڑھائے رکھتا ہوں

پڙهندڙ نسُل . پ نَ

The Reading Generation

1960 جي ڏهاڪي ۾ عبدالله حسين ” اُداس نسلين“ نالي ڪتاب لکيو. 70 واري ڏهاڪي ۾ وري ماڻڪَ ”لُڙهندَڙ نَسُل“ نالي ڪتاب لکي پنهنجي دورَ جي عڪاسي ڪرڻ جي ڪوشش ڪئي. امداد حُسينيءَ وري 70 واري ڏهاڪي ۾ ئي لکيو:

انڌي ماءُ ڄڻيندي آهي اونڌا سونڌا ٻارَ
ايندڙ نسل سَمورو هوندو گونگا ٻوڙا ٻارَ

هر دور جي نوجوانن کي اُداس، لُڙهندَڙ، ڪَڙهندڙ، ڪُڙهندڙ، ٻَرندڙ، چُرندڙ، ڪِرَندڙ، اوسيئڙو ڪَندَڙُ، ياڙي، ڪاٺُو، پاڇوڪَڙُ، ڪاوڙيل ۽ وِڙهندڙ نسلن سان منسوب ڪري سَگهجي ٿو، پَر اسان اِنهن سيني وِچان ”پڙهندڙ“ نسل جا ڳولائو آهيون. ڪتابن کي ڪاڳر تان کڻي ڪمپيوٽر جي دنيا ۾ آڻڻ، ٻين لفظن ۾ برقي ڪتاب يعنی e-books ناهي ورهائڻ جي وسيلي پڙهندڙ نسل کي وَڌڻ، ويجهَڻ ۽ هِڪَ ٻِئي کي ڳولي سَهڪاري تحريڪ جي رستي تي آڻِڻَ جي آسَ رکون ٿا.

پَڙهندڙ نَسل (پَــنَ) ڪا بہ تنظيمَ ناهي. اُنَ جو ڪو بہ صدر، عُهديدار يا پايو وِجهندڙ نہ آهي. جيڪڏهن ڪو بہ شخص اهڙي دعويٰ ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو ڪُوڙو آهي. نہ ئي وري پَنَ جي نالي ڪي پئسا گڏ ڪيا ويندا. جيڪڏهن ڪو اهڙي ڪوشش ڪري ٿو تہ پَڪَ ڄاڻو تہ اُهو بہ ڪُوڙو آهي.
جَهڙيءَ طَرَح وڻن جا پَنَ ساوا، ڳاڙها، نيرا، پيلا يا ناسي هوندا آهن اَهڙيءَ طرح پَڙهندڙ نَسُل وارا پَنَ بہ مختَلِف آهن ۽ هوندا. اُهي ساڳئي ئي وقت اُداس ۽ پڙهندڙ، ٻَرندڙ ۽ پڙهندڙ، سُست ۽ پڙهندڙ يا وِڙهندڙ ۽ پڙهندڙ بہ ٿي سگهن ٿا. ٻين لفظن ۾ پَنَ ڪا خُصوصيِ ۽ ٽالي لڳل ڪِلَب Exclusive Club نہ آهي.
ڪوشش اها هوندي تہ پَنَ جا سڀ ڪَم ڪار سَهڪاري ۽ رَضاڪار بنيادن تي ٿين، پر ممڪن آهي تہ ڪي ڪم اُجرتي بنيادن تي بہ ٿِين. اهڙي حالت ۾ پَنَ پاڻ هِڪَٻئي جي مدد ڪَرڻ جي اُصولَ هيٺ ڏي وَٺُ ڪندا ۽ غيرتجارتي non-commercial رهندا. پَنَن پاران ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز digitize ڪرڻ جي عَملَ مان ڪو بہ مالي فائدو يا نفعو حاصل ڪرڻ جي ڪوشش نہ ڪئي ويندي.
ڪتابن کي ڊِجيٽائِيز ڪرڻ کان پو ٻيو اهم مرحلو وِرهائڻ distribution جو ٿيندو. اِهو ڪم ڪرڻ وارن مان جيڪڏهن ڪو پيسا ڪمائي سگهي ٿو تہ ڀلي ڪمائي، رُڳو پَنَن سان اُن جو ڪو بہ لاڳاپو نہ هوندو.

پَئَن کي کُليل اکرن ۾ صلاح ڏجي ٿي تہ هو وَسَ پٽاندڙ وڏِ
کان وَڏِ ڪتاب خريد ڪَري ڪتابن جي ليکڪَن، ڇپائيندڙن ۽
ڇاپيندڙن کي هِمٿائِن. پر ساڳِئي وقت عِلم حاصل ڪرڻ ۽ ڄاڻ
کي ڦهلائڻ جي ڪوشش دوران ڪَنهن بہ رُڪاوٽ کي نہ مڃن.
شيخ اَيازَ علمَ، ڄاڻَ، سمجهہَ ۽ ڏاهپَ کي گيتَ، بيتَ، سِٽَ،
پُڪارَ سان تَشبيهہ ڏيندي انهن سيني کي بَمن، گولين ۽ بارودَ
جي مدِ مقابل بيهاريو آهي. اياز چوي ٿو تہ:
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن، جي ويريءَ تي وار ڪَرن ٿا.
... ...
جئن جئن جاڙ وڌي ٿي جَڳَ ۾، هو ٻوليءَ جي آڙ ڇُپن ٿا؛
ريتيءَ تي راتاها ڪن ٿا، موٽي مَنجهہِ پهاڙ ڇُپن ٿا؛
... ...
ڪالهہَ هُيا جي سُرخ گُلن جيئن، اڄڪلهہ نيلا پيلا آهن؛
گيتَ بہِ ڄڻ گوريلا آهن........
... ...
هي بيتُ اَٿي، هي بَم- گولو،
جيڪي بہ ڪٽين، جيڪي بہ ڪٽين!
مون لاءِ ٻنهي ۾ فَرَقُ نہ آ، هي بيتُ بہ بَمَ جو ساٿي آ،
جنهن رڻَ ۾ رات ڪَيا راڙا، تنهن هَڏَ ۽ چَمَ جو ساٿي آ -
اِن حسابَ سان اٽڃاٽائي کي پاڻَ تي اِهو سوچي مَڙهڻ تہ
”هاٽي ويڙهہ ۽ عمل جو دور آهي، اُن ڪري پڙهڻ تي وقت نہ
وڃايو“ ناداني‌ءَ جي نشاني آهي.

پَنَ جو پڙهڻ عام ڪِتابي ڪيڙن وانگر رُڳو نِصابي ڪتابن تائين محدود نہ هوندو. رڳو نصابي ڪتابن ۾ پاڻ کي قيد ڪري ڇڏڻ سان سماج ۽ سماجي حالتن تان نظر ڪڄي ويندي ۽ نتيجي طور سماجي ۽ حڪومتي پاليسيون policies اڻڄاڻن ۽ نادانن جي هٿن ۾ رهنديون. پَنَ نِصابي ڪتابن سان گڏوگڏ ادبي، تاريخي، سياسي، سماجي، اقتصادي، سائنسي ۽ ٻين ڪتابن کي پڙهي سماجي حالتن کي بهتر بنائڻ جي ڪوشش ڪندا.

پَڙهندڙ نَسُل جا پَنَ سيني کي **چو، ڇالاءِ ۽ ڪيئن** جهڙن سوالن کي هر بَيانَ تي لاڳو ڪرڻ جي ڪوشش ڏين ٿا ۽ انهن تي ويچار ڪرڻ سان گڏ جوابَ ڳولڻ کي نہ رڳو پنهنجو حق، پر فرض ۽ اٽل گهرج unavoidable necessity سمجهندي ڪتابن کي پاڻ پڙهڻ ۽ وڌ کان وڌ ماڻهن تائين پهچائڻ جي ڪوشش جديد ترين طريقن وسيلي ڪرڻ جو ويچار رکن ٿا.

توهان بہ پڙهڻ، پڙهائڻ ۽ ڦهلائڻ جي اِن سهڪاري تحريڪ ۾ شامل ٿي سگهو ٿا، بَس پنهنجي اوسي پاسي ۾ ڏِسو، هر قسم جا ڳاڙها توڙي نيرا، ساوا توڙي پيلا پن ضرور نظر اچي ويندا.

وڻ وڻ کي مون ياڪي پاتي چيو تہ ”منهنجا ياءُ
پهتو منهنجي من ۾ تنهنجي پَنَ پَنَ جو پڙلاءُ“.
- اياز (ڪلهي پاتم ڪينرو)